اقبال اور اشتراکیت

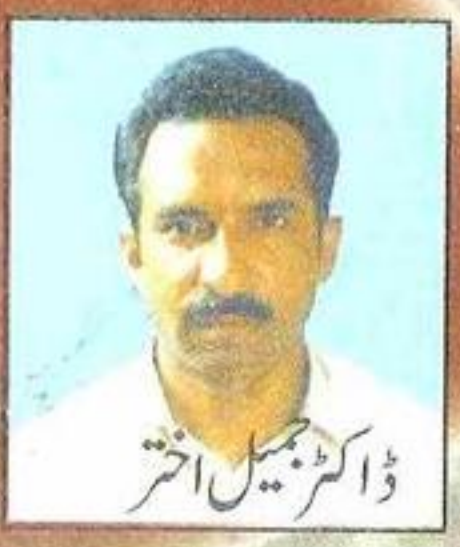

ڈاکٹر جمیل اختر

اقبال
اور
اشتراکیت

ڈاکٹر جمیل اختر

اس کتاب کی اشاعت میں دہلی اُردو اکیڈمی، حکومت دہلی کا
جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

اقبال اور اشتراکیت

ڈاکٹر جمیل اختر

زیر اہتمام:
انٹرنیشنل اُردو فاؤنڈیشن
ڈی۔۱۴۹-ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵

©

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : اقبال اور اشتراکیت

مصنف : ڈاکٹر جمیل اختر

تعداد : ۴۰۰

سن اشاعت : اکتوبر ۲۰۰۱ء

قیمت : -/75 روپے

ناشر : ڈاکٹر جمیل اختر

زیر اہتمام : انٹرنیشنل اُردو فاؤنڈیشن

ڈی۔۱۴۹-ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر اوکھلا،

نئی دہلی۔۲۵ فون: 6197512

ملنے کے پتے

(۱) انجمن ترقی اُردو ہند۔اُردو گھر، رائیوز ایونو، نئی دہلی

(۲) مکتبہ جامعہ، اُردو بازار دلی۔۶

(۳) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

(۴) موڈرن پبلی شنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

(۵) مکتبہ استعارا غفار اپارٹمنٹس، 248، گلی نمبر ۱۰، غفار منزل۔نئی دہلی۔۲۵

(۶) سیمانت پرکاشن کوچہ روہیلا۔دریا گنج، دہلی۔۶

(۷) کتاب منزل اور بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

IQBAL AUR ISHTERAKIYET

Dr. Jameel Akhtar

International Urdu Foundation

D-149, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar,
New Delhi - 110025 Tel : 6197512
October 2001 Rs: 75/-

کیا اور کہاں

۱۔ دیباچہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

۲۔ کچھ اپنی زبان میں

۳۔ اشتراکیت کیا ہے؟

۴۔ خطوط اور مضامین اقبال کا تجزیہ

۵۔ کلام اقبال کا تجزیہ

۶۔ نقد اقبال کا مطالعہ

۷۔ حاصل بحث

۸۔ کتابیات

انتساب

اپنے بڑے ابو
جناب حسنین سید صاحب
کے
نام
جنہوں نے اپنی پوری زندگی راہِ خدا
میں وقف کر دی
اور جو
خود اقبال کے پرستاروں میں ہیں
خدا انہیں عمر دراز عطا کرے
تا کہ
ان کا سایہ شفقت تا دیر ہم
پر قائم رہے۔

.....

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

دیباچہ

اقبال بیسویں صدی کے سب سے بڑے اردو شاعر ہیں۔ پیدا تو ہوئے وہ سیالکوٹ میں، لیکن اپنی فارسی شاعری کی وجہ سے ایران میں وہ اقبال لاہوری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ لاہور سے ان کی شاعری کو ایک خاص نسبت ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کے لیے انہوں نے جو نظمیں لکھیں اُن سے نہ صرف ان کو مقبولیت اور شہرت ملی، بلکہ ان نظموں کا رجحان اقبال کا مزاج بن گیا۔

پنجاب کا محکمۂ تعلیم اردو کا ایک بہت بڑا مرکز، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ سب سے اہم مرکز بن چکا تھا۔ اردو میں ترجمے تو فورٹ ولیم کالج میں، انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے تھے، اور ان کتابوں کی وجہ سے اردو نثر بول چال کی زبان (دلّی اور لکھنؤ کے محاورے/روزمرّہ) کے مطابق ہوئی۔ لیکن لاہور میں جو ترجمے ہوئے، جو نصابی کتابیں لکھی گئیں اُن سے نئے خیالات کو فروغ ملا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد اردو کی اس تعمیرِ نو کے سب سے اہم ستون ہیں، ان کی پشت پر سر سید احمد خان کا بھی ہاتھ ہے۔ سر سیّد کے خیالات اور حالی کی شاعری نوجوان اقبال کے سماجی احساس اور فکری نشو ونما کی بنیاد ہیں۔ جو سمت ان دونوں سے اقبال کی فکر کو ملی، اس میں علم کے ساتھ ارتقاء جاری رہا۔ ان دونوں سے اقبال کو ملت کا درد ہی نہیں ملا، وسیع النظری بھی ملی۔ اقبال کو سر کا خطاب تو برطانوی سرکار نے دیا، لیکن دو خطاب اُن کو قارئین نے دیئے۔ شاعرِ انسانیت بھی تھے۔ سوامی رام تیرتھ ان کے دوستوں میں سے تھے۔ میں نے سوامی رام تیرتھ کی ایک نظم پڑھی تھی، جس میں کئی مصرعے ایسے ہیں، جو اقبال کے کلام میں بھی ہیں۔ ایسی کوئی تحقیق میری نظر سے نہیں گزری، جس

میں اس بات کا تعین کیا گیا ہو کہ ان مشترکہ مصرعوں کا خالق کون ہے؟

اقبال فلسفے کے باقاعدہ طالبعلم تھے۔ برگساں، شوپنہار، نٹشے، فشٹے وغیرہ کا نام تو لیا جاتا ہے، لیکن کارل مارکس جیسے فلسفی کو لائق توجہ نہیں سمجھا جاتا، شاید اس لیے کہ ہمارے مبصر مارکس کے نظریے کو شاید فلسفے کے بجائے سیاست کے تحت رکھتے ہیں، حالانکہ ان دونوں سے ان کی واقفیت کچھ قابل فخر نہیں ہے۔ صرف وہ، جو فلسفے کے طالب علم تھے یا ہیں، مارکس کو، فلسفی کی حیثیت سے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اقبال نے اگر مارکس کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا، تو کم از کم اُسے سمجھا ضرور، اور وہ یہ بات بھی مانتے تھے کہ جب تک ذاتی منافع کے لیے انسانی محنت کا استحصال ختم نہیں ہوگا، ایک منصفانہ معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا۔ مارکس کے لیے انہوں نے کہا:

آں کلیمِ بے تجلّی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کارل مارکس کے علاوہ اوروں کے بھی اثرات اقبال پر ہیں۔ لیکن اسلامی معاشرے کو وہ بالشوزم سے قریب تر سمجھتے تھے، جس میں خدا کی وحدانیت کا اضافہ ہو تو وہی اسلام ہے۔

ڈاکٹر جمیل اختر نے عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر پر بڑی محنت اور لگن سے کام کیا ہے، اور اچھا کام کیا ہے۔ کچھ اشاریے بھی مرتب کیے ہیں اور ابلاغ عامہ کی انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اقبال اور اشتراکت کے موضوع پر انہوں نے محنت سے یہ رسالہ لکھا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔ یہاں وہاں مضامین میں تو اس موضوع پر لکھا گیا ہے، لیکن جس توجہ سے اس پر کام ہونا چاہئے تھا، نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر جمیل اختر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ قابل ذکر کام کیا ہے۔

کمال احمد صدیقی
۱۷ ستمبر ۲۰۰۱

۲۰۲ منیر کاوہار
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۷

کچھ اپنی زبان میں

ہر عظیم انسان کی طرح علامہ اقبال کی شخصیت بھی متنازعہ فیہ رہی ہے۔ تنازع کی بڑی وجہ خود علامہ اقبال کے نظریے کا تضاد رہا ہے۔ ان کی فکر نے بھی کروٹیں بدلی ہیں۔ اور تنازع کو بنیاد فراہم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو کبھی اسلام کا مبلغ اعلیٰ قرار دیا گیا تو کبھی سوشلزم کا حامی وطرفدار، کبھی اشتراکیت کے حمایتی کہے گئے تو کبھی سرمایہ داری کے مخالف، نظریۂ پاکستان کا بانی ہونے کے باوجود محبِ وطن ہندستان بھی قرار دیا گیا۔ ہر فرقے، ہر نظریے اور ہر ازم کے لوگوں نے اقبال کی ہمہ جہت شخصیت کی گونا گونی سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے نظریے کا حامی قرار دیا۔ اقبال کے نظریے اور شاعری کی تفہیم بھی ایک خاص طرح کی عینک لگا کر کی گئی جس سے ان کی شخصیت ٹکڑوں میں بٹ گئی اور آفاق گیر شخصیت کا مالک اقبال فرقوں اور نظریوں کی بندر بانٹ میں متنازع بھی بنا اور ان کی عالم گیر شخصیت کو گزند بھی پہنچی۔

اقبال کے متضاد نظریے نے ہی اقبال شناسی کے اتنے در وا کیے کہ اقبال کو خود در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ بیان صفائی دینے کے باوجود بھی اس نظریے کے طرفداروں نے ان کی جاں بخشی نہیں کی اور ان کے فکری تضاد سے فائدہ اٹھا کر اقبال کو اپنا حمایتی بنائے رکھا۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا علم بردار ہونے کے باوجود اقبال آج بھی اپنی ہمہ گیر آفاقی شخصیت کے نتیجے میں کسی ایک فرقے، مذہب یا ازم کا نہیں بلکہ پوری دنیا کے انسانوں اور ہر ملک کے لوگوں کا ہے۔ تمام انسانوں کے دلوں کی دھڑکن

ہےاور ہرایک کو یکساں عزیز ہے۔

اقبال کی اِسی انسانیت نوازی، انسان دوستی، اور ہمہ گیریت نے اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے نئے نئے در وا کیے۔ مخالفت اور موافقت میں لوگ صف آراء ہوئے۔ سب نے ایک دوسرے کی کاٹ کرتے ہوئے اقبال کو اپنے نظریے سے قریب تر بتلا کر ان کا دفاع کیا۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا علم بردار ہونے کے باجود اسلامی فقہ یا قانون شریعت کی تعبیر نو پر اصرار کے سبب اقبال کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے کہ احیائے اسلام اور نئے مسلم معاشرے سے متعلق اقبال کا نظریہ اجتہادی تھا۔ نظریہ خودی پیش کرنے اور وجودی تصوّف کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے پر بھی لوگ ان کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ پھر سیاسی میدان میں مسلمانوں کی علاحدہ شناخت یعنی مسلم نیشنلزم کی بنیادوں پر الگ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کے باعث ہندستانی عوام کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہو گیا۔ علاقائیت فرقہ واریت اور سیاسی یا نظریاتی تعصّب کی بنا پر اقبال کی شدید مخالفت ہوئی۔ بلکہ ان کی کردار کشی کی باقاعدہ مہم بھی چلائی گئی جس میں مختلف قسم کے لوگ شامل تھے۔

ہر طبقے اور فرقے کی شدید مخالفت کے باوجود اقبال کی فکر پر کوئی قدغن نہیں لگا سکا اور اقبال نئے معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ جہاں کہیں سے بھی تبدیلی کے آثار نظر آئے اس کا بڑھ کر استقبال کیا۔ منفی پہلوؤں کو درکنار کرتے ہوئے اس کے مثبت پہلوؤں پر زیادہ نظر رکھی۔ معاشرے کے جبر وستم سے انسان کو نجات دلانے کے لیے ہر اس انقلاب کا خیر مقدم کیا جو انسانیت کی فلاح کے لیے تھا۔ اِسی انقلاب میں ایک انقلاب ''انقلاب روس'' تھا جس کا بانی مارکس تھا۔ اقبال نے فلسفہ اشتراکیت کے مثبت پہلوؤں سے جو انسانیت کی فلاح اور اس کی بقا کے لیے تھا استفادہ کرتے ہوئے انقلاب روس کا خیر مقدم کیا۔ اُسے امید کی ایک روشن کرن سے

تعبیر کرتے ہوئے عالم انسانیت کے لیے ایک تغذیہ بخش انقلاب قرار دیا۔

انقلاب روس کا پر جوش استقبال کرنے اور مارکس کے نظریہ ''اشتراکیت'' کی حمایت کرنے پر بھی ایک بڑے طبقے نے اقبال کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور اقبال کو غیر اشتراکی قرار دینے کے لیے جن دلیلوں کا سہارا لیا وہ پائیدار ثابت نہیں ہو سکیں۔ اور اقبال کو براہ راست اشتراکی کہنے کی بجائے محتاط رویہ اپناتے ہوئے ''اشتراکی مسلم'' مان لینے میں ہی عافیت محسوس کی۔ مسلم کا لفظ اس لیے لگائے رکھا کہ مسلمانوں کا ہمدرد اور مسیحا کہا جانے والا اقبال خدا کے منکروں کی جماعت میں نہ چلا جائے۔

لیکن دوسری طرف اقبال کے حمایتی اور اس کے شیدائی بھی اقبال کو رجعت پسندوں کے حوالے کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اقبال کے اندر انقلابی فکر کی جو بہتات ہے اُسے نظر انداز کر کے اقبال کو رجعت پسندوں کے حوالے کر دینا خود انسانی اور قومی جرم سے کم نہ ہوگا۔ اس لیے ان لوگوں نے بھی درمیان کی راہ نکالتے ہوئے کہا کہ اقبال کے اسلامی فکر سے چڑنے کی ضرورت نہیں، اس طرح چڑ کر انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا لیکن مخالف رجعت پسندوں کو فائدہ ضرور پہنچایا جا سکتا ہے۔ اقبال کی آفاقی اقدار جو انسانیت پر زیادہ حاوی ہیں کو دیکھتے ہوئے آج اقبال کو چھوڑ دینا انقلاب اور عوامی عظمت و برتری کے ایک طاقتور حربے کو ہاتھ سے پھینک دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے جذباتیت کے بجائے عقل سے کام لیتے ہوئے اقبال کو اسلام پسندوں کے نرغے سے بچائے رکھنے کے لیے اقبال کی فکر کے ان پہلوؤں کو زیادہ زوردار طریقے سے اجاگر کیا جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور انسانی استبداد کے نظاموں کے خلاف تھا۔

اقبال اور اشتراکیت کے تعلق سے شروع سے اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کچھ حمایت میں اور کچھ مخالفت میں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے اقبال کو اشتراکی

قرار دیا ہے اور ایک طبقہ وہ ہے جس نے اقبال کو اشتراکی کہنے پر سخت اعتراض کیا ہے۔ حمایت اور مخالفت دونوں میں لوگ حد سے تجاوز کر گئے۔ اور اقبال ان دونوں کے بیچ سینڈوچ بن گئے۔ اشتراکیت کی مخالفت میں لکھے گئے مضمون میں اقبال کو اسلامی شاعر قرار دینے کی بھرپور کوشش کی گئی جب کہ اقبال خود بھی راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ایسی حالت میں انہیں اسلامی شاعرِ قرار دینا شاعر انسانیت کے ساتھ زیادتی ہے۔

یوں تو اقبال اور اشتراکیت کے حوالے سے اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر ردِّ عمل کے طور پر لکھا گیا ہے، جس میں سنجیدگی اور گہرائیِ فکر کے بجائے جذباتیت زیادہ ہے۔ فوری عمل کے طور پر لکھے گئے یہ مضامین اقبال کا دفاع کرنے میں ایک حد تک ناکام رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان مضامین میں اقبال کی مذہبی فکر کو حربے کے طور پر استعمال کر کے ان کو اشتراکیت سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کی فکر کا غالب حصہ جو شاعرِ انسانیت کا ہے، جس میں انسانی دردمندی مکمل طور پر حاوی نظر آتا ہے یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

میں نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں اقبال سے متعلق دونوں طرح کی آراء کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ اور اقبال کی صحیح حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر اب تک شائع شدہ تمام مضامین اور کتابوں کا تجزیہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ ہوا ہے اُسے دیانت داری سے پیش کر دیا گیا ہے۔ اقبال اور اشتراکیت پر اس تحقیقی نقطہ نظر سے اتنی تفصیل کے ساتھ پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے سے اقبال کی شخصیت اور فکر کا یہ رخ جو اب تک تضادوں کے گھیرے میں تھا پہلی بار پوری وضاحت سے سامنے آیا ہے۔

اس مقالے کا مقصد اقبال کی صحیح تفہیم پیش کرنا ہے۔ اور یہ واضح کرنا ہے کہ

سبھی اشتراکی منکرِ خدا نہیں ہوتے۔ بلکہ مسلمان رہتے ہوئے بھی نظریۂ اشتراکیت کے مثبت پہلوؤں سے جو انسانیت کی فلاح کے لیے ہیں بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کہیں بھی اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا بس ضرورت ہے ذرا وسیع النظری سے کام لینے اور جذباتیت سے گریز کرنے کی۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ حقیری کاوش اقبال شناسی اور اقبال فہمی میں معاون ہوگی اور اقبال کی پرکھ نئے انداز سے ہو سکے گی۔

جمیل اختر

ستمبر ۲۰۰۰ء

نئی دہلی

اشتراکیت کیا ہے؟

اشتراکیت صرف کسی عقیدے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظریۂ حیات ہے، جو ایک غیر طبقاتی سماج کی تشکیل چاہتا ہے۔ جس کے اندر سبھوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ حاکم اور محکوم، امیر اور غریب کی کوئی تمیز نہ ہو بلکہ سبھی انسان برابر ہوں۔ کوئی کسی سے برتر اور بدتر نہ ہو۔

یوں اشتراکیت انگریزی زبان کے لفظ Communism کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ لاطینی سے مستعار ہے۔ Random house Dictionary of English Language میں کمیونزم کے معنی ''جائداد کی مشترکہ ملکیت پر مبنی نظام کا ایک اصول یا طریق کار''[1] درج ہے۔

قومی انگریزی اردو لغت میں اس کی تفصیل یوں درج ہے:

> ''ایک نظریہ یا قاعدہ جس کی رو سے جائیداد کی حقیقی ملکیت معاشرے یا ریاست کو حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے تمام جائیداد اجتماعی یا اشتمالی ملکیت ہو جاتی ہے۔ معاشی نظریہ نظام جس کے تحت پیداوار کے وسائل، تقسیم کے ذرائع اور صنعتی پیداوار کے استعمال کو ریاست کنٹرول کرتی ہے''۔2

جامعی انگلش اردو ڈکشنری میں Communism کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''اشتمالیت، مساوات، مزدکیت، مال واملاک کوقوم کی مشترک
ملک بنانے کا اصول جس کی رو سے ہر فرد کو حسب قابلیت اور
حسب ضرورت حصہ دیا جائے۔''3

لینن نے بھی اسے لاطینی لفظ تسلیم کرتے ہوئے کمیونزم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

'' کمیونسٹ لاطینی لفظ ہے، کمیونس کا مطلب ہے مشترکہ۔
کمیونسٹ معاشرے کا مطلب ہے سب کچھ مشترکہ یعنی زمین،
فیکٹریاں اور محنت سب مشترکہ۔ یہ ہے کمیونزم'' 4

اشتراکیت یا اشتراکی نظام کا خواب ۱۸۴۴ میں کارل مارکس نے دیکھا اور اس نے زندگی سے متعلق ایک مکمل نظریۂ حیات دیا جو آگے چل کر مارکس ازم کے نام سے منسوب ہوگیا۔

موجودہ اشتراکیت کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز کی محققانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۴۴ء کی اقتصادی اور فلسفیانہ دستاویزات میں کارل مارکس نے کہا تھا۔

''اشتراکیت مستقبل قریب کی ضروری شکل اور جاندار اصول
ہے'' 5

اشتراکیت کو ہم ایک ایسی تحریک سے تعبیر کر سکتے ہیں جو نجی ملکیت کا استحصال کرنے والے نظام کے خلاف برسر پیکار ہے۔ اس تحریک کا اصل محرک اور حقیقی طاقت وہ محنت کش طبقہ ہے جو ساری دنیا میں غالب اکثریت کا مالک ہے۔

اشتراکی نظام ابتدا ہی سے اقتدار محنت کشوں کے حوالے کرتا ہے بنیادی ذرائع پیداوار کو عوامی ملکیت تصور کرتا ہے اور تمام سماجی رشتوں کی ازسرنو تعبیر کرتا ہے۔

اشتراکیت موجودہ معاشرے کے ارتقا کی ایک شکل ہے۔ اشتراک وتعاون نے انسان کو آج ارتقاء کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ اشتراک وتعاون کا جذبہ انسان

کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اشتراک وتعاون کے اس جذبے کا پتہ ہمیں انسانی تہذیب کے مطالعے سے بھی معلوم پڑتا ہے کہ انسان کے عہد بہ عہد ترقی اور اس کے ارتقاء کا راز بھی اسی جذبہ میں پنہاں ہے۔ انسان کے لیے ارسطو نے سماجی جاندار کا لفظ اسی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ انسان نہ تو بغیر سماج کے تنہا رہ سکتا ہے۔ اور نہ اشتراک وتعاون کے بغیر کوئی کام کرسکتا ہے۔ سماج کا لفظ ہی افراد اور افرادی قوت دونوں کو ظاہر کرتا ہے اور یہ افرادی قوت دراصل اشتراک وتعاون اور میل وجول کی ہی قوت ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے ابتدا سے ہی اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے مل جل کر رہنے اور تعاون واشتراک کے ذریعے ضروریات زندگی کے حصول کی جدوجہد کا عہد کیا۔ موجودہ زمانے کو ترقی کی اس انتہا پر پہنچانے میں ہم سے پہلے کے لوگوں کی مشترکہ کوششوں کا زبردست دخل رہا ہے۔ مارکس نے ۱۸۴۴ء کی اقتصادی اور فلسفیانہ دستاویزات میں کہا تھا:

''تاریخ کی ساری تحریک اشتراکیت کو جنم دینے کا حقیقی اقدام ہے۔ اس کی عملی زندگی مختلف مدارج میں وجود میں آتی ہے''۔ 6

انسانی معاشرے کی تاریخ لوگوں کے درمیان مختلف النوع روابط سے عبارت ہے۔ ان رابطوں کی بنیاد پر طویل مدت تک قائم رہنے والے اتحاد کی داغ بیل پڑتی ہے جو خاندان اور قبیلے سے شروع ہوکر طبقات، ریاستوں اور عالمی نظاموں پر ختم ہوتے ہیں۔

ایک زمانے تک انسان اپنی زندگی، نجی ملکیت کی بنیاد پر گزارنے پر مجبور رہا ہے۔ حالانکہ قدرتی طور پر انسان انفرادیت پسند نہیں ہوتا لیکن نجی ملکیت کا تعلق تین اہم باتوں میں مضمر ہے۔ اول یہ کہ محنت کے لیے اپنی نجی ضرورت اور کام کے مطابق اوزار وغیرہ کی ملکیت کہ یہ انفرادی طریقے پر ہی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ہل،

کدال، پھاوڑا، چھینی اور ہتھوڑا وغیرہ۔ دوسرے اس کا تعلق دست کاری کی چیزوں کی تقسیم اور تبادلے سے ہے جس کے بغیر محنت کی اجرت کا امکان نہیں ہوسکتا۔ تیسرے اشیاء ضروری کی تیاری محدود مقدار میں ہونے کے سبب بڑی اکثریت کے لیے ان کی فراہمی مشکل ہوجاتی ہے۔ اس کمی کے سبب سے چیز کی خریداری اور اس کی ملکیت خاص اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

اشتراکیت نے یہ بات ثابت کی کہ مشین کی مدد سے بھاری مقدار میں پیداوار ہونے سے نجی ملکیت کے دور کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ زبردست اور بہترین پیداوار کرنے والی مشینیں لاکھوں آدمیوں کو مسلسل تکنیکی عمل میں متحد کرتی ہیں۔ کام کرنے والے اپنی ذاتی خصوصیات اور رجحانات کو درمیان میں لائے بغیر اشیاء کی تیاری کے دوران پوری پیداواری تنظیم کی کڑیاں بن جاتے ہیں چنانچہ کاروباری لحاظ سے اجتماعیت پسند ہوجاتے ہیں۔

اوّل اوّل یہ صورت حال سرمایہ دارانہ نظام میں خاصے بڑے پیمانے پر پیدا ہوتی ہے لیکن اس میں اور اشتراکی نظام میں ایک زبردست تضاد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ محنت زیادہ سے زیادہ مشترکہ تو ہوتی جاتی ہے لیکن اس محنت کے نتیجے میں تیار ہونے والی اشیاء کا مالک تو کوئی سرمایہ دار ہی ہوتا ہے اور ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت برقرار رہتی ہی۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی تحریک کو شروع سے ہی سرمایہ دار مملکتوں کے دولت مند طبقے نے دبانے کی کوشش کی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مدد سے اشتراکیت کے خلاف بھرپور پروپیگنڈہ کرتا ہے اور اسے ہوّا بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ تحریک عام انسانوں کی فلاح و بہبود کی سخت دشمن ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سماج کی مرتی ہوئی قوتوں نے ہمیشہ ترقی پسند رجحانات کے خلاف زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گمراہ کر کے سماجی ترقی کو روکنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ لیکن اس نوعیت کی کوششوں سے کسی بھی حقیقت پسندانہ تحریک کو چند سالوں کے لیے

سست رفتار تو بنایا جا سکتا ہے انجام کار اس کو روکنا ناممکن ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں عوام کو بچپن ہی سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ دولت کی نجی ملکیت کی بنیاد پر ہی وہ اپنی شخصی آزادی اور خودمختاری برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب عوام کو سماجی ملکیت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے بارے میں کہا جاتا ہے تو ان کی پریشانی بالکل فطری ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک تو نجی ملکیت ہی میں ان کی مسرّتیں پنہاں ہیں۔ اشتراکیت کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو قومیا کر ہمارے مروّجہ طریقہ زندگی کو برباد کر دیا جائے گا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی نظام محنت سے حاصل کی گئی اشیاء پر نہ تو قبضہ کرتا ہے اور نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ مارکس اور اینجلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ:

''ہم محنت سے پیدا کی ہوئی اور براہ راست زندگی کی بحالی کے لیے استعمال کی جانے والی چیزوں کی شخصی ملکیت بالکل ختم کرنا نہیں چاہتے، ایسی ملکیت کو جو اتنا فاضل نہیں چھوڑ سکتی جس سے دوسروں کی محنت پر قبضہ جمایا جا سکے۔ ہم ملکیت کی صرف اسی بڑی نوعیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس میں مزدور محض اس لیے زندہ رہتا ہے کہ وہ سرمائے میں اضافہ کرے اور محض اس حد تک زندہ رہتا ہے جس حد تک حکمراں طبقے کے مفادات مقتضی ہوتے ہیں۔'' 7

اشتراکی نظام شخصی ملکیت اور شہری انفرادیت پر قطعی طور سے کسی بھی قسم کا قبضہ نہیں کرتا بلکہ انفرادیت کو ان لوگوں کے جبر سے بچانے کی کوشش کرتا ہے جو نجی ملکیت والے معاشرے میں سماجی ضرورتوں کی تکمیل کرنے والے ذرائع پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔

اشتراکیت کو کسی قسم کی بھیانک اور خوفزدہ کر دینے والی شے سمجھنا غلط فہمی

ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اشتراکی نظام میں محنت اور عمل کی اہمیت ہے چنانچہ یہ کاہل سرمایہ داروں کے لیے تو بہر حال ایک خطرناک چیز ہے لیکن محنت کش کے لیے مسرت و شادمانی کا وسیلہ ہے۔

کام کی خوبی اور مقدار کے لحاظ سے اجرت کی ادائیگی سرمائے کے خاتمے اور جمہوری نظام کے قیام کا پیش خیمہ ہے۔ اشتراکی ایسے حالات پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں جس میں محنت کی مجبوریاں دور ہوتی ہیں اور محنت ہر شخص کی زندگی کا اہم تقاضا بن جاتی ہے اگر چہ محنت کی نوعیت انفرادی حیثیت اور رجحانات کے مطابق جدا جدا ہے۔ مثلاً ایک شخص ذہنی یا جسمانی اعتبار سے دوسرے پر برتری رکھتا ہے تو یقیناً وہ مقررہ وقت میں دوسرے سے زیادہ محنت کرتا ہے یا زیادہ عرصے تک محنت کے قابل رہتا ہے۔ اب چونکہ محنت ہی ایک پیمانہ ہے تو وہ پھیلاؤ یا گہرائی سب کے لیے یکساں ہونی چاہئے ورنہ اس سے پیمائش کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس لیے برابر کا جو حق تھا وہ نا برابر محنت کے لیے نابرابری کا حق ٹھہرا۔ یہ حق طبقاتی اونچ نیچ کو تو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ ہر شخص کی حیثیت اوروں کی طرح کام کرنے والے کی ہے۔ لیکن خاموشی کے ساتھ اس فرق کو تسلیم کرتا ہے کہ کام کی صلاحیت میں اونچ نیچ ہونا لازمی ہے۔ یا ایک مثال اور ملاحظہ کیجئے کہ دو شخص کام کی صلاحیت کے اعتبار سے تو یکساں ہیں لیکن نجی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ یعنی ایک کے ذمے زیادہ بچوں کی پرورش ہے اور دوسرا غیر شادی شدہ ہے۔ ایسی صورت میں سماجی ضروریات کے فنڈ میں سے دونوں کو برابر کا حصہ ملنے کے باوجود دراصل ایک کو کم اور دوسرے کو زیادہ ملتا ہے۔ ایسی صورت میں یہی طریق کار، جسے اشتراکی تجویز کرتے ہیں، زیادہ صحیح اور قابلِ قبول ہے کہ:

''ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے، ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے''۔ 8

اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لیے کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز نے ایک

لائحہ عمل مرتب کیا جو ''کمیونسٹ'' یعنی فیسٹو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اشتراکی تحریک مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں سے ان معنوں میں منفرد اور ممتاز ہے کہ یہ مختلف ملکوں کے مزدوروں کی قومی جد و جہد میں قومیت کا امتیاز کیے بغیر پورے مزدور طبقے کے مشترک مفادات پر زور دیتی ہے۔ اشتراکیوں کا مقصد وہی ہے جو مزدوروں کی سبھی دوسری پارٹیوں کا منتہا ہے یعنی محنت کش ایک طبقے کے طور پر منظم ہوں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کے غلبے کا خاتمہ ہو اور محنت کش کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار آئے۔

اشتراکیوں کے نظریاتی نتائج ان حقیقی تعلقات کو صاف لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں جو طبقاتی جد و جہد سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ایسی تاریخی تحریک سے جو ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہے۔ ملکیت کے مروجہ تعلقات کو مٹانا اشتراکیت کی کوئی امتیازی کارگذاری نہیں ہے۔ اس سے پیشتر بھی تاریخی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی ملکیت کے تعلقات میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ انقلاب فرانس نے بورژوا ملکیت کے حق میں جاگیردارانہ ملکیت کو مٹایا۔ اشتراکیت کی امتیازی خصوصیت ملکیت کو نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ ملکیت کو مٹانا ہے۔ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت مال کی پیداوار کے تصرف کی وہ شکل ہے جو طبقاتی اختلافات اور مٹھی بھر دولت مندوں کے ہاتھوں (محنت کشوں کی) اکثریت کے استحصال پر مبنی ہے۔

سرمایہ دار ہونے کا مطلب پیداوار میں ذاتی نہیں بلکہ سماجی حیثیت کا مالک ہونا ہے۔ سرمایہ چونکہ اجتماعی پیداوار ہے لہذا اسے سماج کے تمام اراکین کی متحدہ کوششوں ہی سے حرکت میں لایا جا سکتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ سرمایہ ذاتی نہیں بلکہ سماجی طاقت ہے۔ چنانچہ سرمائے کو جب مشترکہ ملکیت بنایا جاتا ہے تو اس سے ذاتی ملکیت، سماجی ملکیت نہیں بدلتی صرف ملکیت کی سماجی حیثیت بدل جاتی ہے اور اس کی طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

اشتراکیت یا اشتراکی نظام میں اجرتی محنت کی بھی خاص اہمیت ہے۔ اجرتی

محنت کی اوسط قیمت کم سے کم اجرت ہی ہے اور اس میں معاش کی صرف اتنی ہی مقدار شامل ہے جو مزدور کو مزدور بنا کر کسی طرح زندہ رکھنے کے لیے قطعی ضروری ہے۔ لہٰذا اجرت پر کام کرنے والا مزدور اپنی محنت کے ذریعہ جو کچھ تصرف میں لاتا ہے وہ محض اسے زندہ رکھنے کے لیے ہی کافی ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ سماج میں زندہ محنت محض ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے جمع کی ہوئی محنت (یعنی سرمایہ میں) میں اضافہ کیا جاتا ہے، اشتراکی سماج میں جمع کی ہوئی محنت ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے محنت کش کی زندگی میں وسعتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اُسے زیادہ سے زیادہ پُرمسرت بنایا جاتا ہے اور یہ سماجی ترقی کا راستہ ہے۔

سماج کی پیداوار کو اپنے تصرف میں لانے کے حق سے اشتراکیت کسی انسان کو محروم نہیں رکھتی۔ اشتراکی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کو اس اختیار سے محروم کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اس تصرف کے ذریعہ دوسروں کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔

خاندان کے مسئلے پر بھی اشتراکیت کا نظریہ عام سرمایہ دارانہ سماج میں خاندان کی نوعیت سے مختلف ہے۔ موجودہ سرمایہ دار سماج میں خاندان کی بنیاد سرمایہ اور ذاتی منافع پر قائم ہے۔ بوڑھے لوگ اپنے لیے جوانی ہی میں زندگی بسر کرنے کے لیے وافر مقدار میں دولت جمع نہیں کرتے تو ان کی اولاد انہیں ٹھکرا کر در بدر بھٹکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں ہی ماں باپ اپنی اولاد کو علاحدہ کر دیتے ہیں۔ زن و شوہر میں بھی تعلقات کی نوعیت اقتصادی اشتراک و تعاون پر مبنی ہے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف محنت کش بے خاندان رہنے پر مجبور ہے تو دوسری جانب عصمت فروشی کا بازار گرم ہے چنانچہ جب سرمایہ دار طبقہ اشتراکیوں کی ''فرد کو ریاست کی ملکیت'' سمجھنے کی بات سنتا ہے تو اس کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اشتراکی نظام میں عورت کو بھی مشترکہ جائداد تصور کیا جائے گا۔ حالانکہ حقیقت اس کے

برخلاف ہے۔اشتراکی نظام میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کی اس حیثیت کا خاتمہ کیا جائے جس میں وہ صرف پیداوار کا آلہ بن کر رہ گئی ہے۔

وطن اور قومیت کے بارے میں اشتراکیوں کا کہنا ہے کہ محنت کش کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ مزدور طبقے کو سب سے پہلے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔اس کے سامنے ترقی کر کے ایک نئی قوم بننے کا مرحلہ ہوتا ہے۔لہٰذا جیسے ہی محنت کش طبقہ اقتدار حاصل کرے تو سرمایہ دار طبقے کی نشوونما تجارت کی آزادی، عالم گیر منڈی پر ان کی اجارہ داری، ذرائع پیداوار پر ان کے حقوق، محنت کش کے اقتدار حاصل کرتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے تمام ترقی یافتہ مہذب ممالک کا ایک ساتھ تعاون و اشتراک سے عملی قدم اٹھانا ضروری ہے۔اس طرح ایک قوم کے ہاتھوں دوسروں کا استحصال بھی اسی طور پر ختم ہوگا جس طرح فرد کے ہاتھوں فرد کے استحصال کا خاتمہ ہوگا۔جس قدر جلدی قوم کے اندر طبقوں کا اختلاف دور ہوگا اتنی ہی تیزی سے ایک قوم سے دوسری قوم کی عداوت ختم ہوگی۔

برناڈ شا نے مارکس کے بارے میں لکھا تھا:

> ''مارکس نے سماجی ارتقاء کے قانون دریافت کر لیے ہیں اور اچھی طرح جان لیا ہے کہ کیا پیش آئے گا۔تاریخ کا تانا بانا اس کے ہاتھ میں ہے۔''9

تاریخ کے اس تانے بانے اور سماجی نشوونما کے قانون کا نام مارکس نے مادّی جدلیت رکھا۔ مارکس کے یہاں مادّہ ثانوی چیز نہیں بلکہ سب سے اہم چیز ہے۔اس کی شکست وریخت اور تغیر وتبدل میں کائنات کا راز مضمر ہے۔وہ مادّے کو بقائے باہم اور دائمی وقائمی مانتا ہے۔ مارکس کے نزدیک مادّہ تغیر پذیر ہے یہ کبھی فنا نہیں ہوتا بلکہ ایک شکل سے دوسری شکل بدلتا رہتا ہے۔تغیر پذیری کا یہ عمل خطِ مستقیم میں نہیں ہوتا بلکہ تغیر کا سلسلہ دائرہ یا سیدھی لکیر میں ہونے کے بجائے متضاد رجحانات کی کش مکش اور ٹکراؤ کے ٹیڑھے میڑھے راستے سے ہو کر جاتا ہے۔اس کے مطابق

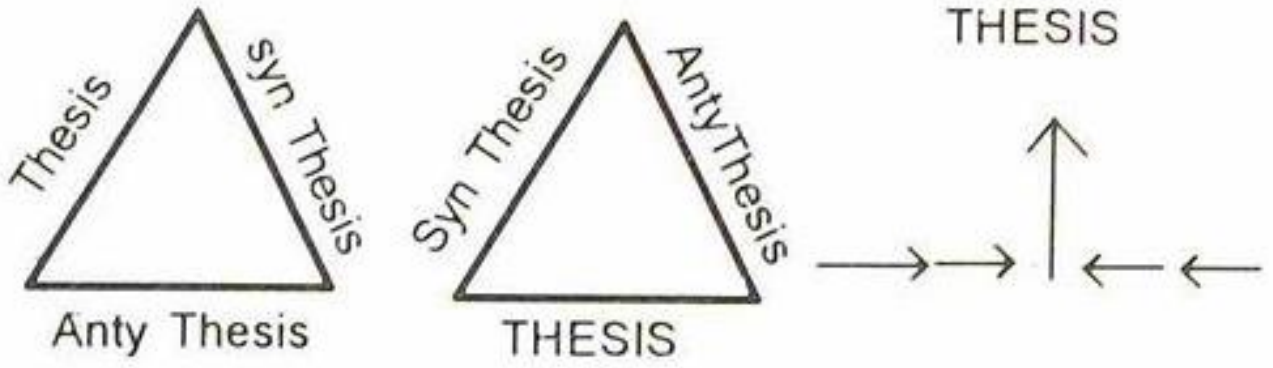

Synthesis اور Antythesis کے ٹکراؤ سے Thesis پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب دو چیزیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو تیسری چیز کا وجود ہوتا ہے۔ جب دو خیال آپس میں ٹکراتے ہیں تو تیسرا خیال پیدا ہوتا ہے۔

مارکس نے کائنات کے اسرار و رُموز کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مادّی جدلیت کے طریقے سے کام لیا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی تخلیق کسی ماورائی یا غیر مرئی طاقت کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ جدلیت کے عمل سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس لیے خالق کائنات پر اس کا کوئی یقین نہیں۔ وہ دنیا کو ایک اتفاقی حادثہ مانتا ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء مادّی جدلیت کے قانون کے تحت ایک منضبط اور منظم طریقے سے ایک اصول میں بندھی ہوتی ہے۔

ایک عرصہ تک مفکروں کا خیال تھا کہ مادّہ کی حیثیت ثانوی ہے اور خیال ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ آدمی کسی کے متعلق سوچتا ہے اس لیے وہ چیز موجود ہوتی ہے۔ مارکس نے اِسے باطل قرار دیا اور خیال کو مادّہ کی ترقی یافتہ شکل بتلایا اس لیے اس کے نزدیک غیر مادّی اور ماورائی قوت کو انسان کا خالق کہنا بعید از عقل ہے۔ اس پر ہیگل اور اس کے درمیان امتیازی خط کھینچ جاتا ہے۔ حالانکہ جدلیت کے نظریے کو سب سے پہلے ہیگل ہی نے سمجھا تھا۔ مارکس نے ہیگل کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے آدمی کو سر کے بل کھڑا کر دیا تھا میں نے اُسے مناسب ہیئت

عطا لی۔اس فکری پہلو نے تاریخ کی معاشی تشریح کی۔ابھی تک تاریخ بادشاہوں کی عظمتوں کی داستان تھی مارکس نے اُسے طبقاتی کشمکش کی تاریخ کا عنوان دیا۔اس کے خیال میں دنیا میں صرف دو طبقے ہیں ایک حاکم جس کے قبضے میں ذرائع پیداوار ہیں اور دوسرا محکوم جو اپنی محنت فروخت کر کے زندہ رہتا ہے۔اس لیے اس نے طبقاتی کشمکش کو ختم کر کے ایک نیا سماج قائم کرنے کی دعوت دی۔یہ نیا سماج مزدوروں کی قیادت میں بنایا جا سکتا ہے۔یہی وہ انقلابی فلسفہ ہے جس کے گرد انقلابی طاقتیں گھومتی ہیں۔اس کی بنیاد پر دنیا کے تمام ملکوں کی اشتراکی پارٹیاں اپنا لائحہ عمل تیار کرتی ہیں۔

اشتراکیت کے مفہوم اور اِمکانات کے اس مختصر جائزے کے بعد آخر میں مارکس اور اینجلز کی ان تجاویز کا جو ان دانشوروں نے ''کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو'' تیار کرتے ہوئے پیش کی ہیں، مطالعہ کریں تو اشتراکیت کے مقاصد بہت واضح طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں۔مارکس اور اینجلز نے اشتراکی نظام کے قیام کے سلسلے میں درج ذیل سفارشیں کیں ہیں۔

۱۔ زمین کے حق ملکیت کو مٹانا اور پورے لگان کو رِفاہ عام پر خرچ کرنا۔

۲۔ زیادہ آمدنی کے ساتھ بڑھتا ہوا ٹیکس لگانا۔

۳۔ وراثت کے حقوق کو منسوخ کرنا۔

۴۔ وطن سے فرار ہونے والوں اور باغیوں کی جائیداد ضبط کرنا۔

۵۔ لین دین کا سارا کاروبار ایک قومی بنک کے ذریعہ، جس میں ریاست کا سرمایہ اور صرف اسی کا اجارہ ہو اور ریاست کے ہاتھوں میں مرکوز ہونا۔

۶۔ قل وحرکت اور خبر رسانی کے تمام وسیلوں پر ریاست کا مرکزی

قبضہ ہونا

۷۔ ریاست کے کارخانوں اور آلات پیداوار کو وسعت دینا۔ ایک مشترکہ منصوبے کے مطابق بنجر زمین کو کاشت میں لانا اور زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرنا۔

۸۔ سب پر کام کرنے کی یکساں ذمہ داری ہونا۔ صنعتی فوجیں بنانا، خاص طور پر زراعت کے لیے۔

۹۔ زراعت اور صنعت کو ملانا اور ملک میں آبادی کی تقسیم ایسے مادّی انداز میں کرنا کہ رفتہ رفتہ شہر اور دیہات کا فرق ختم ہو جائے۔

۱۰۔ عام اسکولوں کے ذریعہ تمام بچوں کو مفت تعلیم دینا۔ کارخانوں میں بچوں سے موجودہ شکل میں کام لینے کا رواج ختم کرنا۔ تعلیم کو صنعتی پیداوار کے ساتھ ملانا وغیرہ وغیرہ۔10

مارکس اور اینجلز مزید لکھتے ہیں کہ:

''نشو ونما کے دوران میں جب طبقاتی امتیاز مٹ جائیں گے اور تمام پیداوار پوری قوم کی ایک وسیع سماجی انجمن کے ہاتھوں میں جمع ہو جائے گی، اس وقت اقتدار عامہ کی سیاسی حیثیت جاتی رہے گی۔ سیاسی اقتدار اصل میں ایک طبقے کا دوسرے پر منظم تشدد ہے۔

پرولتاریہ (مزدور) اگر بورژوا (سرمایہ دار) طبقے سے جدوجہد کے دوران حالات سے اس پر مجبور ہوتا ہے کہ ایک طبقے کی حیثیت سے اپنی تنظیم کرے۔ اگر انقلاب کی بدولت وہ حکمراں طبقہ بنتا ہے اور اس طرح پیداوار کے پرانے تعلقات کو زبردستی ختم کر دیتا ہے جن پر طبقاتی اختلافات اور خود طبقات کا وجود

منحصر ہے اور اس طرح ایک طبقے کی حیثیت سے خود اپنے اقتدار
کو بھی ختم کر دیتا ہے۔
پرانے بورژوا اور اس کے طبقوں اور طبقاتی اختلافوں کے بدلے
ایک ایسی انجمن قائم ہوگی جس میں ہر شخص کی آزاد ترقی سبھوں
کی آزاد ترقی کی شرط ہوگی۔'' 11

مارکس کی تعلیمات کو اس کے رفیق کار فریڈرک اینجلز نے مزید وسعتیں عطا کیں اور ولادمیر ایلیچ لینن نے اس میں مناسب تبدیلیاں کر کے اُسے یعنی اشتراکیت کو ایک قابل عمل اور انسانیت کے لیے بہترین سماج کی تشکیل کا وسیلہ بنا کر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں سوویت یونین میں ایک عظیم انقلاب کے سہارے عملی شکل عطا کی۔ ۱۹۱۷ء میں سویت یونین میں اشتراکی سماج قائم ہوا اور ساٹھ برس کی مدت میں یہ ملک ترقی اور خوشحالی کی ان منزلوں پر پہنچ گیا جہاں تک پہنچنے کے لیے عام حالات میں اُسے صدیاں لگ جاتیں۔

اکتوبر انقلاب اور دنیا کے بیش تر ممالک میں مزدور تحریک کے مقبول ہونے کا اثر اقبال کی شاعری پر بھی پڑا (اگر چہ اقبال خود کو اشتراکی کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کے کلام کا جائزہ لینے پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال نہ صرف یہ کہ اشتراکی تھے بلکہ اشتراکیت کے بہت بڑے حامی بھی تھے۔ انہوں نے لاشعوری طور پر اشتراکیت کے موقف کی بھرپور حمایت کی ہے) آئندہ صفحات میں خطوط، مضامین اور کلام اقبال کے مطالعے سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حواشی

(1) Random House Dictionary of English Language.

(2) Qaumi English Urdu Dictionary by Jameel Jalbi Educational Publishing House. Delhi-1993 Page 411

(3) Jami English Urdu Dictionary by Kalimuddin Ahmad. National Council for Promotion of Urdu Language. 1994 Page 1001

(4) A theory or system of organisation based on the holding of all property in Common.

5۔ لینن۔''نوجوانوں کی انجمنوں کے فریضے'' بحوالہ ''کمیونزم کے بارے میں سوالات و جوابات'' حصہ اول صفحہ ۷۔

6۔ کارل مارکس۔بحوالہ کمیونزم کے بارے میں سوالات و جوابات حصہ اول۔صفحہ ۵

7۔ بحوالہ کمیونسٹ مینی فیسٹو۔

8۔ بحوالہ کمیونزم کے بارے میں سوالات و جوابات۔اول صفحہ ۷

9۔ بحوالہ کمیونسٹ مینی فسٹو۔

10۔ مارکس۔''گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر''

11۔ مارکس۔فریڈرک اینجلز'' کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو۔

''خطوط اور مضامین اقبال کا تجزیہ''

اقبال سے متعلق اشتراکیت کی خبریں اُس وقت زیادہ گرم ہوئیں جب روزنامہ "زمین دار" میں اقبال کو صرف اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا مبلغ اعلا گردانا گیا۔ اُس وقت سے آج تک یہ موضوع زیر بحث ہے۔ اقبال اشتراکی تھے یا نہیں تھے اس کا جواب خود سے دینے کے بجائے بہتر ہے کہ اقبال کو خود اُن کی تحریروں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کریں۔ تو آیئے ہم بھی اپنے مطالعہ کی ابتداء اُسی تاریخی مضمون سے کریں جس میں پہلی بار علامہ اقبال کو اشتراکی کہا گیا تھا یہ مضمون ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ ''زمین'' دار میں شائع ہوا تھا جو انقلاب کے سابق ایڈیٹر شمس الدین حسن کا تھا۔ جس میں انہوں نے پروفیسر غلام حسین کا دفاع کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اشتراکیت کی حمایت کوئی جرم نہیں کیوں کہ علامہ اقبال بھی بالشویک خیالات رکھتے ہیں۔ انہوں نے لکھا.....

> ''بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفۂ سیاست کا لب لباب ہے۔ اور کارل مارکس کے فلسفے کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی ''خضر راہ'' اور ''پیام مشرق'' کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک

اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ بھی ہیں ''پیامِ مشرق'' میں ''قسمت نامہ سرمایہ و مزدور'' اور ''نوائے وقت'' کے عنوان سے جو مختصر سی نظمیں لکھی ہیں اُن سے قطع نظر کر کے صفحہ نمبر ۱۵۶ کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزوست

ترجمہ: تیر، نیزے۔ خنجر اور شمشیر کی مجھے آرزو ہے، میرے ساتھ مت آؤ مجھے حسین کے مسلک کی آرزو ہے۔

کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں ہیں''(۱)

مذکورہ بالا مضمون کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال کو کسی نے یہ اطلاع دی کہ آپ سے بالشویک خیالات منسوب کیے گئے ہیں۔ اقبال پر اس کا شدید ردِ عمل ہوا اور انہوں نے بغیر کسی تحقیق کے کہ یہ مضمون حقیقتاً کیا ہے اور کس نے لکھا ہے ایک مفصل تردیدی بیان اُسی روز لکھ کر مدیر ''زمین دار'' کے نام ارسال کر دیا جو دوسرے دن اخبار میں شائع ہوا۔ بیان یہ تھا۔

مکرم بندہ جناب ایڈیٹر صاحب زمین دار

السلام علیکم

میں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی

تردید میرا فرض ہے۔
میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے۔ جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث، حرمتِ ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔ اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردّ عمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔ اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے۔ اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اُسے قائم رکھتا ہے۔ اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی

اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے **"فاصبحتم بنعمتہٖ اخواناً"** میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ یورپ اس نکتہ کو نظر انداز کر کے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دِلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ انظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رُجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصولِ اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا اُن سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل ایکانمی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ

اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے اُن کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔

محمد اقبال

بیرسٹر ایٹ لا (2)

علامہ اقبال کے اس خط سے اقبال اور اشتراکیت کے تعلق کی کافی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اشتراکیت کے بارے میں علامہ کے خیالات کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے یہ خط خاص اہمیت کا حامل ہے۔

یہ خط چونکہ ایک الزام کی تردید کے لیے فوری ردِّ عمل کی صورت میں اس قدر عجلت میں لکھا گیا تھا کہ اس وقت تک علامہ نے اس بیان کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا جس کی صفائی کے لیے انہوں نے اتنا طویل بیان دے ڈالا۔ اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہو سکا تھا کہ حقیقت میں ان کے بارے میں کیا لکھا گیا ہے۔ لفظ اشتراکیت کو سن کر انہوں نے ایک طویل بیان دے ڈالا بغیر یہ جانے ہوئے کہ ان پر الزام کیا لگا ہے؟ اس لیے علامہ کو اس موضوع پر غور و فکر کا موقع نہیں مل سکا کیوں کہ جس وقت اس واقعے کی اقبال کو اطلاع ملی اُسی وقت انہوں نے جواب تحریر کر دیا اور دوسرے ہی دن وہ خط زمین دار میں شائع بھی ہو گیا۔ لہٰذا اشتراکیت سے متعلق مذکورہ بالا خط میں علامہ کے جو خیالات ظاہر ہوتے ہیں اُن کی نوعیت بہت زیادہ غور و فکر کے بعد نتائج پر پہنچنے کی نہیں ہے بلکہ اس موضوع پر علامہ اقبال پہلے ہی سے جو کچھ بھی سوچتے رہے ہوں گے۔ اُن کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ تاہم اس خط کے ذریعے علامہ کے خیالات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلی شکل یہ ہے کہ علامہ کے نزدیک بالشویک

خیالات رکھنا دائرہ اسلام ہی سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ دوئم یہ کہ سرمایہ داری کی قوت کا حدِ اعتدال سے گزرنا علامہ کے خیال میں ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن اس لعنت سے پیچھا چھڑانے کے لیے معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دینے میں علامہ یقین نہیں کرتے اور اس قوت کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے قرآن کریم کے میراث، حرمتِ ربا اور زکوٰۃ کے قوانین کو مستحسن قرار دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کا کہنا یہ ہے کہ خود روسی قوم کو (جہاں اشتراکیت کو نہایت کامیابی کے ساتھ نظام حکومت میں رائج کیا گیا ہے) اپنے موجود نظام کے نقائص کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اسلام یا اس سے ملتے جُلتے اصول اپنانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اور آخر میں وہ قرآن کریم کی اقتصادی تعلیمات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کی سفارش کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ لاہور کی مزدور یونین کے مسلمان اراکین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو غلام السیدین کے نام اپنے خط میں اقبال اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں۔

''سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے، مذہب کے، مخالف ہیں، اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور ان شاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادّی تعبیر سراسر غلط ہے روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔

باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے
مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔'' 3

آل احمد سرور کے نام اپنے ایک خط میں اس کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے کوئی اور ازم
کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف
اسلام ہی ایک حقیقت ہے۔ جو بنی نوعِ انسان کے لیے ہر
نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ
نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ
آپ انہیں نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس
صورت میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہو جائیں
گے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کا View مجھ سے مختلف ہو یا آپ خود
دین اسلام کے حقائق کو ہی ناقص تصور کریں۔ اس دوسری
صورت میں بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہو۔'' 4

اقبال اسلام ہی کے ذریعے سرمایہ کی قوت کے مناسب استعمال کے امکانات پر یقین رکھتے ہیں اور مساوات کو جو اشتراکی نظام کی اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام کی ذریعے سے ہی قابل عمل تصور کرتے ہیں۔ اپنی ذاتی ڈائری میں اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''کسی تصور کی عملی طاقت اُس شخص کی قوت پر منحصر ہوتی ہے جس
میں یہ خود محصور ہوتی ہے۔ حضرت محمدؐ، گوتم بدھ اور عیسیٰ مسیح تصور
مساوات کے عظیم پیکر ہیں۔ پھر بھی دنیا میں صرف اسلام ہی وہ
طاقت ہے جو ہنوز مساوات کی سمت میں سرگرم عمل ہے۔" 5

''مخزن'' ۱۹۰۲ء میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے عنوان سے علامہ کا ایک مضمون شائع

ہوا تھا۔اس مضمون کا موضوع ملک وقوم کی فلاح و بہبود ہے۔انسان کا بنی نوع انسان کے دیگر افراد سے جو مبارک رشتہ قائم ہے اس کے ادراک کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لیے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے اس کے ہر فعل میں ایک روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کر ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیدیں اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہئے۔تا کہ اُس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینے سے تعصّبات اور توہمات کے رنگ کو دور کر کے اُسے مجلّہ و مصفا کر دیتی ہے۔صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔مگر اپنے اخلاقی تعلیمات سے محض جاہل ہوتے ہیں ان کی زندگی بہائم زندگی ہے۔کیوں کہ اُن کا ہر فعل خود غرضی اور بیجا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ان کے تاثرات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد تک محدود ہوتا ہے۔اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بہ حیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع سے ہے۔حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو۔اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم انسان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔'' 6

مدیر ''زمین دار'' کے نام مفصل خط، خواجہ غلام السیدین کے خط کا اقتباس/

ڈائری کے چند جملے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے عنوان سے شائع ہونے والے مضمون کے مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے جو بات خاص طور پر اشراکیت اور اقبال کے رشتے کی وضاحت میں اُبھر کر سامنے آئی ہے وہ یہ کہ علامہ کسی بھی قیمت پر اشتراکیت کو خود سے منسوب کیے جانے کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ مارکس انجلز اور لینن کی تعلیمات کا انہوں نے خواہ براہ راست مطالعہ کیا ہو یا دوسروں کے خیالات کے توسط سے اُن تک پہنچے ہوں اُن کی افادیت سے انہیں انکار نہیں۔ بلکہ بڑی حد تک وہ اُن تعلیمات کو پسند کرتے تھے لیکن اُس کی نوعیت یوں تھی کہ اسلام کے مطالعے سے مساوات سرمایے کی مناسب تقسیم اور زمین کی ملکیت کے بارے میں اُن کا نظریہ اشتراکیت سے کسی قدر جدا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو اشتراکی مسلم بھی کہہ سکتے تھے۔ سر فرانسس ینگ ہز بینڈ کے نام اقبال کے خط میں یہ اصطلاح درج ہے۔ اس خط میں اقبال نے بالشوزم اور اسلام کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اقبال خود کو اشتراکی اور اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ کی حیثیت سے یاد کیے جانے پر سخت معترض ہوتے ہیں۔

''زمین دار'' میں مضمون کی اشاعت اور اس کے ردّ عمل میں علامہ اقبال کا جواب ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ آخر وہ کون سے حالات تھے جس میں علامہ اقبال نے بہ عجلت تمام گھبراہٹ کے عالم میں مضمون دیکھتے بغیر جواب تحریر کر دیا۔ تو آیئے ذرا اُن حالات کی طرف لوٹ چلیں اور جائزہ لیں۔

علامہ اقبال فکری طور پر خواہ کتنا ہی آزاد تھے مگر عملی طور پر وہ شدید بندش میں تھے۔ یہ بندش انہوں نے خود اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی۔ چونکہ وہ برطانوی سامراج کو اپنے عمل سے ناخوش کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے کوئی بھی ایسا اقدام کرنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکتے تھے جس سے حکومت کی چشم ابرو پر شکن پڑنے کا بھی احتمال ہو سکتا ہو۔ اس کے لیے انہوں نے قارئین کا حلقہ وسیع نہ ہونے کی وجہ سے اُردو زبان ترک

کر کے فارسی میں شاعری شروع کی جس کی وضاحت ۱۹۲۲ء میں لندن کے جلسہ میں انہوں نے کی۔ جو شخص حکومت کی نگاہوں میں سرخرو ہونے کے لیے اس قدر احتیاط سے کام لے رہا تھا وہ اپنے آپ کو اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا مبلغ اعلا کہلوانا کس طرح پسند کر سکتا تھا۔ وہ بھی ان حالات میں جب کہ بالشویک سازش کا مقدمہ لاہور میں چل رہا تھا اور ایک بزرگ پروفیسر غلام حسین اُس میں ماخوذ تھے اور ان کے ہی دفاع کے لیے یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ ایسی حالت میں علامہ اقبال پر اس کا شدید ردّ عمل ہونا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ اس خبر سے اُن کے پیروں کے نیچے کی زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اور انہوں نے بوکھلاہٹ میں بغیر سوچے سمجھے جواب تحریر کر دیا اور اپنی صفائی پیش کر دی۔

دوسرے یہ واقعہ جس زمانے میں پیش آیا وہ ہماری تاریخ کا انتہائی نازک دور تھا۔ انقلاب روس نے برطانوی سامراج کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھی۔ اور اس کی جگہ بالشوزم کے ہوّے نے لے لی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں اقبال کو جب اعلانیہ اشتراکی کہا گیا تھا اُس وقت ہندوستان میں اشتراکی خیالات کے نشوونما کا اور اشتراکی طرز کی مزدور یونینوں کے آغاز کا زمانہ تھا دوسری طرف بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم نے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کا کام برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے سپرد کیا تھا۔ حالات کی اس روش کو حکومت انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور ایسے لوگوں پر سخت نظر رکھی جا رہی تھی۔ ان حالات میں اقبال کا اشتراکیت سے انکار ہی نہیں بلکہ شدید اختلاف کا اظہار کرنا اپنی محافظت کے لیے نہایت ضروری تھا ورنہ شک کے نتیجے میں خطرناک انجام سے گزرنا پڑتا۔ اور اُن کی نائٹ ہڈ بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی جس کے حصول پر ابھی چھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

ایک طرف اقبال کے ساتھ یہ حالات تھے جن کے تقاضے سے مجبور ہو کر اقبال نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرح کا بیان دیا۔ تاکہ حکومتِ وقت کی نگاہوں

میں مزید سرخ رو ہوں۔ اور قدر و منزلت میں کوئی کمی نہ ہو۔ ہمارے شاعر مشرق کی گردن خطاب بندگی سے جھک گئی تھی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کو اشتراکیت سے اس قدر نفرت نہیں تھی۔ بلکہ وہ اِسے مستحسن نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب روس کو 'بطن گیتی سے آفتاب تازہ'' کی بشارت دی۔ اور اسے خوش آمدید کیا۔ وہ شخص جو اشتراکیت سے اس قدر نفرت کا اظہار کر رہا ہے دوسری طرف اشتراکی انقلاب کو اتنی گرم جوشی سے خوش آمدید کیوں کہے گا۔ جب تک کہ وہ اس کے کسی پہلو سے پورے طور پر مطمئن نہ ہو۔ اور اقبال اشتراکیت کی صرف مذہب دشمنی کے علاوہ اس کی تمام باتوں سے متفق تھے۔ اقبال سرمایہ داری اور ملوکیت دونوں کے مخالف تھے۔ اور نہ وہ دولت کی غیر مساوی تقسیم سے مطمئن تھے۔ وہ بھی سوشلزم کے حامی تھے۔ مزدوروں کے حق میں تھے۔ اور ایسے انقلاب کے متمنی تھے جس میں امیر، غریب، ذات پات وغیرہ کی کوئی تفریق نہ ہو بلکہ سبھی انسان برابر ہوں۔

اقبال انقلاب روس سے پندرہ برس قبل ہی سے ایسے خیالات رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف علم الاقتصاد میں ملکیت کے باب میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اُن میں بھی کارل مارکس کے افکار کی صدائے بازگشت ہے۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے:۔

''تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں ملکیت یا جائیداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا محنت کی پیداوار میں حسبِ ضرورت سب کا حصہ تھا ہر شئے ہر شخص کی ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاص شئے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی نہیں۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی نہ چوری کا کھٹکا تھا۔ قبائل انسان مل کر گزارا کرتے تھے اور امن و صلح کاری (کذا) کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن

میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہاتوں میں اس وقت بھی کسی نہ کسی شکل میں مروج ہے زمانۂ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلا اور افضل ہے۔

'' جائدادِ شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے لہٰذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ اُن بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی و قدرتی اصول مشارکت فی الاشیاء کو مروج کیا جائے اور کچھ نہیں تو ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے کیونکہ ہر شئے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز رہی ہے لیکن اس کا مفصل ذکر ہم اس ابتدائی کتاب میں نہیں دینا چاہتے۔'' 7

تیس سال بعد بال جبرئیل میں اس بات کو یوں دُہرایا ۔

وِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اب ذرا اس اقتباس پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ۱۹۰۳ء میں جب اقبال نے علم الاقتصاد لکھی تھی تو اس وقت اُن کا ذہن سوشلزم کے اس تصور کو قبول کر چکا تھا جو وسط انیسویں صدی میں کارل مارکس نے ایک مکمل فلسفے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ روس میں مارکس کے فلسفے کی کامیابی نے اقبال کے اس رُجحان کو پختہ کر دیا۔ خدا کے وجود سے انکار اور مذہب سے تنفر کے باوجود مارکسیت کے خیالات کی ترویج و اشاعت وہ کرتے رہے۔ سوشلزم کو وہ صرف ایک پہلو کے علاوہ بقیہ پہلو سے بہتر سمجھتے

تھے اور کہتے تھے کہ سوویت نظام میں اگر خدا کے وجود کا اقرار بھی شامل ہو جائے تو وہ عین اسلام ہوگا۔ یعنی سوشلزم کی تعلیمات اُنہیں اسلام سے اس قدر مشابہہ نظر آئیں۔ اقبال نے ۱۹۳۱ء میں اسلام اور بالشوزم کے باہمی ربط پر روشنی ڈالتے ہوئے سر فرانسس ینگ ہزبینڈ کے نام اپنے ایک خط میں دوٹوک انداز میں لکھا تھا کہ:۔

''اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت قریب آجاتا ہے۔ اس لیے میں متعجب نہ ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔'' 8

یہ خط سیول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ ایک اخبار نویس نے جب اُن سے اُن کے خیالات کی وضاحت چاہی تو انہوں نے فرمایا:۔

''اسلام سوشلسٹ طرز کا مذہب ہے مطلق سوشلزم اور نجی ملکیت کے باب میں قرآن نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ آپ جسے بالشوزم اور سامراج کہتے ہیں عصر حاضر ان دونوں میں بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ علاقائی سلطنتوں کے دن لد چکے ہیں۔ بالشوزم میں بھی، مطلق سوشلزم کے معنوں میں ترمیمیں کی جانے لگی ہیں ممکن ہے کہ معاشی نقطۂ نگاہ کے اختلاف کی بنا پر روس اور برطانیہ برسر پیکار ہو جائیں۔ اس حالت میں صحیح فکر رکھنے والوں کی ہمدردیاں حق وصداقت کے ساتھ ہونگی۔'' 9

اقبال کے مندرجہ بالا بیان اور ''زمین دار'' میں شائع شدہ تردیدی مراسلے کو

سامنے رکھیں تو دونوں میں بڑا فرق محسوس کریں گے۔ اول الذکر میں بالشویک خیالات رکھنے والوں کو قطعیت کے ساتھ خارج از اسلام قرار دیا تھا۔ لیکن آخری الذکر بیان میں انہوں نے اسلام کو سوشلسٹ طرز کا مذہب کہا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ معاشی نقطۂ نگاہ کے اختلاف کی بنا پر اگر روس اور برطانیہ برسر پیکار ہوئے تو اُن کی ہمدردی روس کے ساتھ ہوگی۔ ان کی ہمدردی مزید ان کے اشتراکی خیالات کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ورنہ وہ اقبال جو کل تک برطانیہ کا ہم نوا تھا۔ اور جس کی گردن خطاب بندگی سے جھکی ہوئی تھی آج اعلانیہ اپنی اشتراکیت کا اقرار کر رہا ہے۔ گرچہ اس میں کچھ تبدیلی حالات کا بھی اثر ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اقبال کے خیالات کی پختگی کارفرما ہے۔ حالات کی تبدیلی تو یہ تھی اس وقت برطانوی سامراج کی گرفت ہندوستان پر ڈھیلی پڑ چکی تھی اور روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی اس لیے علامہ اقبال نے اپنی دلی خواہش کا اظہار اعلانیہ طور پر کر دیا۔ جسے کل تک وہ اپنے سینے میں چھپاتے پھرتے تھے۔ آج وہ حالت نہ تھی کہ کوئی ان پر مقدمہ چلاتا اور اس جرم میں جیل بھیج دیتا۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۴ء تک کا عرصہ کافی طویل عرصہ تھا۔ اس دوران میں اقبال نے مزید غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ دور میں انسانوں کو دکھوں سے نجات دلانے کا واحد راستہ اشتراکی انقلاب ہے۔ انہیں اسلامی انقلاب کے آثار دور دور تک نظر نہ آئے جو ان کے خیال میں انسانوں کے دکھوں کا سب سے بہتر علاج تھا۔ علامہ اقبال کے سامنے لے دے کر ایک راہ باقی رہ گئی تھی اور وہ راہ سوشلزم کی تھی۔ علامہ اقبال کے انہیں خیالات نے ۱۹۳۴ء میں سوشلسٹ پارٹی کے قیام کی تجویز رکھی جو بعد میں ایک پارٹی کے قیام کی شکل میں سامنے آئی۔ شروع میں اس کا جداگانہ وجود نہیں تھا لیکن بعد کو جداگانہ حیثیت ملی جو علامہ اقبال کی عین خواہش کے مطابق تھا۔

اب اقبال کے سوشلزم کے اس تصور کو دیکھئے۔ جو انہوں نے مسٹر جناح کو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک خط میں لکھا تھا۔ جو دولت کی غیر مساوی تقسیم کے متعلق اُن کے

خیالات پر خاص روشنی ڈالتا ہے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:۔

''روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کررہے ہیں کہ گزشتہ دوسو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جارہی ہے۔ مسلمان عام طور پر سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری وسرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے۔ اگر چہ ابھی قوی نہیں ہوا لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت وشدت حاصل کر کے رہے گا۔ جواہر لعل کی منکر خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا تمام تر مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ نے اس ضمن میں کوئی وعدہ نہ کیا تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔'' 10

کیا یہ خیالات اشتراکی نہیں۔ اشتراکیت بھی دولت کی مساوی تقسیم چاہتی ہے اور علامہ اقبال بھی اس کے قائل ہیں۔ وہ موجود غیر مساوی تقسیم سے غیر مطمئن ہیں۔ ان کے خیال میں افلاس اسی وقت دور ہوگا جب دولت کی مساوی تقسیم ہوگی۔

اقبال ہندوستان کی مفلسی اور پسماندگی کو دور کرنے اور معاشی اعتبار سے ترقی کرنے کے خواہش مند تو ہیں اور اس کا علاج بھی اقتصادی طور پر طاقت ور ہونے میں مضمر سمجھتے ہیں۔ لیکن مارکس کی اقتصادی اصلاحات کو پسند کرنے کے باوجود اس کا اظہار صرف اس اندیشے سے نہیں کرتے کہ کہیں لوگ انہیں اشتراکی نہ سمجھ لیں۔ اور یہ لفظ اشتراکی علامہ اقبال کو پسند بھی نہیں تھا۔ اس سے ان کے جذبۂ دینی کو ٹھیس پہنچتی

تھی۔

ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے اُن کی تجاویز ملاحظہ کریں:۔

''وہ ملک جس کا دارومدار محض زراعت پر ہو جیسا کہ ہندوستان کا ہے ترقی کی دوڑ میں کامیاب ہوسکتا ہے نہ قحطوں اور وباؤں سے نجات پا سکتا ہے، جب تک کہ وہ اپنی آبادی کے ضروریات کو پورا کرنے کی راہ اختیار نہ کرے جب تک ہندستان صنعتی ملک نہ ہوگا اور ہم جاپانیوں کی طرح اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہوں گے اُس وقت تک قدرت ہمیں قحط کے تازیانے لگاتی رہے گی۔ طرح طرح کی وبائیں ہمیں ستاتی رہیں گی۔ جن سے ہم جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ضعیف اور ناتواں ہوتے جائیں گے۔ اقوام ہند میں سے ہمارے بھائیوں نے اس راز کو کسی قدر سمجھا ہے اور چونکہ ہر بالطبع اس کام کے لیے موزوں بھی ہیں۔ اس واسطے یقیناً اُن کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو اُن کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی، صنعت کھو بیٹھی، تجارت کھو بیٹھی، اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔''11

اور اسی مسلمان سے وہ تقاضا کرتے ہیں کہ ملک کی یہ حالت بنانے میں کن بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کے ایک خطبے میں اقبال کہتے ہیں۔

''سب سے اہم عقیدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے کو وقف کرتا ہے یہ ہے کہ کیوں کر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے، اس کا فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر اُن کے اسباب کا پتہ لگائے، جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلے پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک اُن بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات و عادات اور اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا ہے۔ اور گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے۔ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اُسے چاہئے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرف داری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے اس لیے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔''12

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اس حقیقت سے واقف تھے کہ ملک و قوم کی حالت بہتر بنانے میں اقتصادیات کی اہمیت بہت زیادہ ہے اب اُن کا ذہن اس مسئلہ میں اُلجھتا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل ہوں جو اہل ہند کے حق میں اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے بہتر معاشی حالت کے ضامن ہو سکیں۔

سرمایہ کی بیجا تقسیم کے وہ مخالف ہیں۔ لیکن اس میں بھی وہ اسلامی اصول کو ہی بہتر گردانتے ہیں۔ ۹ مئی ۱۹۲۲ء کے ایک نجی خط میں اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

''اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ بڑی مقدار میں سرمایہ میں

اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے بالشوزم نے سرمایہ داری کا کلیتًا خاتمہ کر کے انتہائی اقدام کیا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔'' 13

اقبال کی تمام تر ہمدردیاں محنت کش طبقوں کے ساتھ تھی۔ ان کے حقوق کا استحصال انہیں ناگوار گزرتا تھا۔ اور اُن کا دل مزدوروں پر ڈھائے گئے ظلم وستم کو دیکھ کر دُکھتا تھا۔ انہوں نے شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ انہیں اس سے نجات دلانے کا واحد راستہ سرمایہ داری اور ملوکیت کا خاتمہ ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اقبال کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ اس ملک کی بیشتر آبادی جو مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے اس کے مسائل کو نوعیت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس کی تھی اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے سوویت روس کے معاشی تجربے کا دلچسپی سے مطالعہ کیا اور اس سے وہ متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انقلاب روس کا سب سے پہلے خیر مقدم کیا۔ اور انہیں اس انقلاب میں مزدوروں کی فلاح نظر آئی۔ مدت سے اقبال جس انقلاب کے منتظر تھے اس کی جھلک انہیں روسی انقلاب میں نظر آئی اور انہوں نے اِسے ایک نئی زندگی، نئے نظام کی علامت سمجھا۔

اقبال سوشلزم سے اس قدر متاثر تھے کہ محمد دین تاثیر کے بیان کے مطابق اقبال نے'' یہ بات متعدد بار واضح الفاظ میں کہی تھی کہ اگر مجھے کسی مسلم ملک کا سربراہ بنادیا جائے تو وہ سب سے پہلے اُسے سوشلسٹ ریاست بنائیں گے''

جہاں تک سوشلسٹ ریاست بنانے کا سوال ہے تو یہ خیال بھی علامہ نے سوشلسٹ انقلاب ہی سے لیا۔ اس لیے کہ اسلامی سوشلزم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام اور سوشلزم کے درمیان بیر ہے۔ ایک کے یہاں وحدانیت اور روحانیت کی بات ہے دوسرے کہ یہاں خدا کے وجود سے انکار اور مادیت پر زور ہے۔ اور اقبال روحانیت کے قائل تھے۔ ساتھ ہی ساتھ سوشلزم کے اقتصادی فلسفہ سے اتفاق رکھتے

تھے۔یہی بات کانٹول اسمتھ نے لکھا ہے:

''خدا کی منکر اور روحانیت سے تہی ہونے کے باوجود سوشلسٹ تحریک اور سوویت یونین سے اقبال کو ہمدردی تھی'' 14

اور بقول جواہر لال نہرو

''اقبال زندگی کے آخری برسوں میں سوشلزم سے بہت قریب آ گئے تھے۔سوویت یونین نے جو عظیم ترقی کی تھی اس نے انہیں گرویدہ بنالیا تھا'' 15

اقبال کی روس کے ساتھ ہمدردی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ وہاں ایک ایسے نظام کی تشکیل کی کوشش کی جارہی تھی جس میں سبھوں کی ترقی کے یکساں مواقع تھے۔اشتراک وتعاون کی بنیاد پر ایک ایسے نظام کا تجربہ ہورہا تھا جہاں انسانی محنت کے استحصال کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔نجی ملکیت کے خاتمہ نے عوام کے اندر ایک طرح کی خود اعتمادی اور خود اعتباری پیدا کردی تھی۔ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق سہولیات بہم پہنچائی جائے۔اس تصور نے خاص طور پر مزدور طبقے کے اندر بڑا یقین واعتماد پیدا کیا اور اشتراک وتعاون کے جذبے کی وجہ سے روس نے کافی ترقی کی۔اس کی اس تیز رفتار ترقی کو دیکھ کر علامہ اقبال بھی بہت متاثر ہوئے۔انہوں نے بھی ایک ایسی ریاست کا خواب دیکھنا شروع کردیا جہاں سبھی امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔اور یہ چیز انہیں سوشلزم کے اندر ہی نظر آئی۔یہی وجہ ہے انہوں نے سوشلسٹ ریاست کی بات کی۔

علامہ اقبال کی ان تمام تحریروں کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ علامہ اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ان کی تحریروں میں تضادات کے باوجود اس بات کا بے باکانہ اظہار ملتا ہے۔اور وہ کھلم کھلا روس اور روسی انقلاب کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔وہ اشتراکی انقلاب اور اشتراکیت کو اس کی خوبیوں

کی بنا پر سراہتے ہیں وہ اس کے تمام اقتصادی پہلوؤں سے اتفاق کرتے ہیں اور روئے زمین سے انسانی استحصال، نا برابری اور عدم مساوات کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ اشتراکیت کی ان باتوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔

اقبال مسلمان تھے اور ان کا دل جذبہ دینی سے لبریز تھا وہ روئے زمین پر اسلامی انقلاب چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مومن کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اپنی شاعری کا بیشتر حصہ تبلیغ اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کے حس کو بیدار کرنے میں وقف کر دیا اور وہ آخر وقت تک اپنے موقف پر اٹل رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص اسلام کا اتنا بڑا مبلغ ہو وہ اشتراکی کیسے ہو سکتا ہے؟ اور زیادہ تر لوگ اقبال کو مبلغ اسلام کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ لیکن میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اقبال کو اشتراکی کہہ دینے سے ان کے مسلمان ہونے پر کون سا حرف آجاتا ہے۔ ایک شخص بہتر مسلمان ہوتے ہوئے بھی کسی ازم کی اچھائیوں کو بہ نظر استحسان دیکھ سکتا ہے۔ اور اس کو سراہتا ہے۔ کسی کی اچھائیاں تو ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں لیکن کسی کی برائیاں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے ایک مسلمان کی حیثیت سے مارکس کی اس بات کا آخر تک انکار کرتے رہے جو مذہب سے منکر تھیں۔ اس لیے انہوں نے مادیت کی جگہ ہمیشہ روحانیت کو افضلیت دی۔ مادیت اور جدلیت کے فلسفہ کی بھی انہیں باتوں کو قبول کیا جو اسلام سے منحرف نہیں تھیں۔ اقبال نے اشتراکیت کے تمام اقتصادی پہلوؤں سے اتفاق کیا۔ اس لیے بھی کہ اس سے اسلام کسی بھی طرح متاثر ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اشتراکیت میں خدا کے وجود کو شامل کر کے عین اسلام ہونے کی بات بھی کی۔ اور اس ممکنات کی بھی باتیں کیں کہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب روس اسلام پر یا اسلام روس پر غالب آجائے۔ آخر اس کے پیچھے اقبال کی کون سی سوچ تھی

اور اقبال نے ایسی باتیں کیوں کیں؟ ذرا اس کا بھی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اقبال کسی معمولی شخصیت کے انسان تو تھے نہیں، ان کی شخصیت تہہ دار تھی وہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی تھے دنیا پر ان کی گہری نظر تھی وہ حالات کی تبدیلیوں سے بھی بے خبر نہیں تھے۔ پورے عالم میں انسانیت کے اندر جو ایک اضطراب اور بے چینی تھی علامہ اقبال اس سے بہ خوبی واقف تھے۔ ان کی دور اندیشی اور دور بینی ان تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کو پوری شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ اب انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا اور اس کی تیز و تند آندھی سارے خس و خاشاک بہالے جائے گی۔ روس کا انقلاب ان کی نظر کے سامنے تھا۔ اور اس کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس انقلاب کا پوری دنیا میں جس طرح خیر مقدم کیا گیا اقبال نے اسے بھی پوری گہرائی سے محسوس کیا۔ اور فکر کے بعد تجزیے کی بنیاد پر ہی اس نتیجے پر پہنچے اور تب ہی اشتراکیت کی حمایت کی۔ اس لیے یہ تحریک انہیں دنیا میں موجود تمام تحریکوں میں تیز نظر آئی۔ اور اس کی بہت سی باتیں اسلام سے ملتی جلتی تھیں۔ اس وجہ سے بھی اقبال نے اس کو خوش آمدید کیا۔ ملوکیت اور سرمایہ پرستی کے مقابلے میں یہ انقلاب اقبال کے لیے اچھی شروعات تھی۔ اور اس سے مستقبل کے امکانات روشن نظر آ رہے تھے۔ اور بہتر نظام کے لیے زمین ہم وار ہوتی نظر آ رہی تھی۔ روسی انقلاب سے دنیا کی تمام انقلابی قوتوں کو کافی حوصلہ ملا اس انقلاب نے ملوکیت اور سرمایہ پرستی پر کاری ضرب لگائی اور ان لوگوں کے پایہ استقلال میں تزلزل کی کیفیت پیدا کر دی۔ اور پوری دنیا میں انقلاب کی آندھی اور تیز کر دی۔ اقبال جیسا حساس شخص بھلا اس سے کیوں کر نہ متاثر ہوتا۔ اقبال کا اس انقلاب سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ لہٰذا اقبال نے اس سے متاثر ہو کر اس کی حمایت کی۔ اور اس بناء پر انہیں سوشلزم کا حامی کہنا کوئی ایسی بات نہیں جس پر واویلا مچایا جائے۔ اقبال ان معنوں میں ایک اشتراکی تھے اور یہ بات خود ان کی تحریروں سے ثابت ہوتی ہیں۔

حواشی

۱۔ روز نامہ زمین دار۔ مدیر شمس الدین حسن۔ ۲۳ر جون ۱۹۲۳ء
ص:۳ (بحوالہ خطوط اقبال۔ مرتبہ رفیع الدین ہاشمی۔ لاہور)

۲۔ کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم۔ مرتبہ مظفر حسین برنی۔
اردو اکادمی دلی۔ ۱۹۹۵ء ص: ۵۷۔۴۵۳

۳۔ کلیات مکاتیب اقبال جلد چہارم۔ مرتبہ مظفر حسین برنی۔
اردو اکادمی دلی ۱۹۹۸ء ص:۴۰۱۔۳۹۹

۴۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد چہارم مرتبہ مظفر حسین برنی ص:۴۳۶

۵۔ بکھرے خیالات۔ مترجم عبدالحق ص:۸۷

۶۔ مخزن مضمون۔ بچوں کی تعلیم و تربیت۔ علامہ اقبال ۱۹۰۲ء

۷۔ علم الاقتصاد۔ علامہ اقبال ۱۹۰۳ء

۸۔ کلیات مکاتیب اقبال جلد سوم۔ مرتبہ مظفر حسین برنی۔
اردو اکادمی دلی۔ ص: ۱۴۲

۹۔ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر انی۔ اقبال کے نثری افکار

۱۰۔ کلیات مکاتیب اقبال جلد چہارم ص:۹۷۔۴۷۸

۱۱۔ قومی زندگی۔ علامہ اقبال۔ مخزن اکتوبر ۱۹۰۴۔
بحوالہ اقبال کے نثری افکار ص:۶۴

۱۲۔ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ اقبال کے نثری افکار۔۲۴۰

۱۳۔ خطوط اقبال۔ مرتبہ رفیع الدین ہاشمی۔ لاہور ص:۲۲۸

۱۴۔ موڈرن اسلام اِن انڈیا۔ ص:۱۲۸

۱۵۔ ڈسکوری آف انڈیا۔ جواہر لال نہرو ص:۳۰۹

کلام اقبال کا تجزیہ

انقلاب روس کا خیر مقدم کرنے والے ہندستانی شاعروں میں علامہ اقبال کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انقلاب روس کا بڑھ کر خیر مقدم کیا اور اس کو اپنی فکر کا موضوع بنایا، پر جوش انداز میں انقلاب کے نغمے گائے اور بغیر کسی تکلف کے انقلابی خیالات کا اظہار کیا۔ انقلاب روس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوری جنت کو روتی چشمِ آدم کب تلک

اور ''ساقی نامہ'' میں انتہائی مسرت کے ساتھ عوام الناس کو یہ کہہ کر مبارک باد دی ہے ۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

انقلاب کے بعد پرانی سیاست سے بے زاری کی باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے

نئے دور کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ سے چشمے ابلنے لگے

انسان کو غلامی سے چھٹکارا دلانے کے لیے جذبہ کو اس طرح ابھارتے ہیں۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

اقبال انقلاب اتنی تیزی سے چاہتے ہیں کہ سب کچھ منٹوں میں بدل جائے۔ انسان اور انسان کے درمیان جو پردہ ہے وہ ہٹ جائے اور ہر فرد و بشر ایک ہو، نہ کوئی غریب ہو نہ امیر، نہ توانا ہو نہ لاغر بلکہ معاشی اعتبار سے سبھی برابر ہوں۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اقبال پر اشتراکیت کی مہر اس وقت ثبت ہوئی جب اقبال نے ''خضرِ راہ'' میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کے تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا، ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس نظم میں علامہ اقبال نے سرمایہ داروں کے سربستہ رازوں سے پردہ ہٹا دیا ہے اور ایک ایک بات کھول کھول کر مزدوروں کو بتلا دی ہے کہ کس طرح یہ سرمایہ دار تمہارا استحصال کر رہے ہیں اور تم کو اپنی مکارانہ چالوں سے کس طرح مات دیے ہوئے ہیں۔ لیکن اب جاگو اب غفلت کا وقت نہیں ہے اور اپنے حق کے حصول کے لے برسرِ پیکار ہو جاؤ۔

بندۂ مزدور کو جس بے داری کا پیغام علامہ اقبال نے اپنی اس نظم میں دیا ہے کیا اسے اشتراکی تعلیمات کا نچوڑ کہنا غلط ہوگا؟

اقبال کے نزدیک جہاں تک موجودہ سرمایہ دار محرکات کی تنقید کا تعلق ہے بنیادی طور پر اسلام کی تعلیم بھی تقریباً وہی ہے جو اشتراکی نظریوں کی ہے۔ مارکس ہی کے تجربے کی بنیاد پر مزدور جو دولت اور منافع کا اصل پیدا کرنے والا ہے اپنی محنت

کے ثمر سے محروم رہتا ہے اور سرمایہ دار بہ مشکل اسے اس قدر اجرت دیتا ہے کہ وہ زندہ رہ سکے۔

سرمایہ داروں نے مزدور کو غافل رکھنے کے لیے طرح طرح کی افیون دی ہے اور سب کا مقصد انسانیت کی غلط تقسیمیں کرنا ہے۔ انسانیت کی اس تقسیم کو اشتراکیت صفحہ ہستی سے ختم کرنا چاہتی ہے۔ علامہ اقبال بھی انسانیت کی اس تقسیم کے خلاف ہیں جو اسلامی رو سے بھی درست نہیں۔

انقلابِ روس کو خوش آمدید کہتے ہوئے اسے ایک نئی زندگی نئے نظام اور نئے روز و شب سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں کا انسان بھی غیر انقلابی انسانوں کے مقابلے میں بدلا ہوا ہوگا۔ یہاں پر علامہ اقبال کا ایک اقتباس نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا جو انہوں نے ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں لکھا ہے۔

> ''یورپ کی جنگ عظیم ۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب و تمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے''1

اقبال نے جس نئے آدم کے ظہور کا مژدہ سنایا تھا۔ اس نے سوویت یونین میں جنم لیا تھا اور جس نئی دنیا کی تعمیر کی بات کی تھی وہ دراصل انقلاب کے بعد کا روس تھا۔

''خضر راہ'' سے ملتے جلتے خیالات ہمیں ''قسمت نامہ سرمایہ و مزدور'' میں ملتے ہیں۔ جس میں سرمایہ دار بڑی مکاری سے مزدور کو سمجھاتا ہے کہ یہ ظاہری دنیا اور اس کا عیش و آرام جو عارضی ہے اور جن کے حصول کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے وہ میں لے لیتا ہوں اور دوسری دنیا کا ابدی عیش و آرام تمہارے لیے چھوڑتا

ہوں۔ زمین کے اندر جو کچھ ہے میرا اور زمین سے لے کر عرش تک جو کچھ ہے اس کے مالک تم ہو۔

غوغائے کارخانہ آہنگری۔ زمن
گلبانگ ارغنون کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج برد می نہد زمن
باغ بہشت و سدرہ و طوبا ازانِ تو
تلخابۂ کہ درد سر آرد ازان من
صہبائے پاک آدم ، حوا ازان تو
مرغابی و تدرّ و کبوتر ازان من
ظل ہما و شہپر عنقا ازان تو
این خاک و انچہ در شکم رو ازان من
دز خاک تا بہ عرش معلا ازان تو

''پیام مشرق'' کی درج ذیل نظم میں اقبال نے انقلاب روس کی داستان بیان کی ہے۔ زار شاہی کے ساتھ شہنشاہیت کا خاتمہ ہو چکا ہے دنیا کے محنت کش اپنی حکم رانی قائم کرنے کے لیے میدان کارزار میں اتر آئے ہیں۔ سارے سربستہ راز افشا ہو چکے ہیں۔ اور ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اقبال اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے اگر تم نے عقل و دانائی سے کام نہ لیا تو اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤ گے۔

افسر پادشہی رفت و بہ یغمائی رفت
نے اسکندری و نغمۂ دارائی رفت
کوہ کن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست

عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت
یوسفی راز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسون زلیخائی رفت
راز ہائے کہ نہاں بود، ببازار افتاد
آں سخن سازی و آں انجمن آرائی رفت
چشمِ بہ کشای اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی درپے تعمیر جہانِ دگر است

اب ''نوائے مزدور'' کے یہ اشعار دیکھئے۔ جس میں مزدور کا یہ احساس پوری شدت سے کارفرما نظر آتا ہے کہ دنیا کی ساری رونق اور چہل پہل مزدوروں ہی کے دم سے قائم ہے۔ کارخانہ عالم کی ہر چیز اور کاروبارِ سلطنت، سبھی موٹا جھوٹا پہننے والے اور نیم فاقہ زدہ مزدوروں ہی کے زور بازو سے چلتا ہے۔ اہلِ کلیسا بھی ہمارے خون سے جونک کی طرح پلتے ہیں۔ ہمارے ہی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حرام خور کارخانہ داروں کو ریشمی کپڑے اور زر و جواہر نصیب ہوتے ہیں۔ ساری رونق ہماری ہی بدولت ہے۔

زمزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رفت حریر
زخوی فشانی من لعلِ خاتم والی
زاشک کودک من گوہر ستام امیر
زخونِ من چو ز لو فربہی کلیسا را
بزور بازوے من دستِ سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستان زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

بیا کہ تازہ نوامی تراود زرگِ ساز
مے کہ شیشہ گداز و بساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم
بنائے میکدہ می کہن براندازیم
زرہزنان چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزمِ غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بطوف شمع چو پروانہ زیستن تاکے
زخویش ایں ہمہ بے گانہ زیستن تاکے

اور اسی نظم میں مزدور کی بے زاری کا مژدہ بھی سنایا گیا ہے۔ اس کے سینے میں انتقام کی آگ کے شعلے بھڑک چکے ہیں۔ آخر وہ کب تک ان مظالم کو سہتا رہے گا۔ وہ مالک دو جہاں سے زمانے کی اس روش کا شکوہ کرتا ہے۔ جس میں ذلیل و خصیص لوگوں کے ہاتھوں معقول لوگ کھلونا بن رہے ہیں۔ ہنرمند مزدور چند گدھوں کی عیش کی خاطر خود کو ہلاک کر رہا ہے ؎

جہاں تست در دست خس چند
کسان او بہ بندِ نا کے چند

ہنر ور درمیاں کار گایاں
کشد خودرا بہ عیش کرگس چند

''ارض ملک خداست'' کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔ اقبال کس طرح سرمایہ دار اور محنت کش کی تصویر کشی کرتے ہیں ؎

حاصل آئین و دستور ملوک
دہ خدایان فربہ و دہقاں جو دوک

(بادشاہوں آئین و قانون کا حاصل کیا؟ گاؤں کے مالک موٹے تازے اور
کسان چرخے کا چکلہ)

''خطاب بہ ملت روسیاہ'' میں اقبال نے تفصیل کے ساتھ سرمایہ دار کے ہاتھوں مزدور کے استحصال کا دردناک منظر پیش کیا ہے۔ سرمایہ دار کے ہاتھوں مزدور کی روٹی تو چھینی ہی جاتی ہے اس کی بیٹی بھی بے آبرو ہوتی ہے ؎

خواجہ نان بندہ مزدور خورد
آبروئے دختر مزدور برد

اسی نظم میں اقبال محلات تعمیر کر کے کوچے میں پڑے رہنے والے مزدور کی حالت زار بیان کرتے ہیں ؎

نے بجامش بادہ و نے در سبوست
کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

کس طرح ایک قوم دوسرے قوم کو کھا رہی ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا پھل کوئی اور کھاتا ہے ؎

امتے برامتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

سرمایہ دار صرف کمزور اور مفلس مزدور کی روٹی ہی نہیں چھینتا بلکہ اس سے اس قدر کام لیتا ہے کہ اس کا جسم ناتواں ناکارہ ہو جاتا ہے تاکہ وہ اس کی قدم بوسی کرتا رہے ؎

از ضعیفاں ناں ابودن حکمت است
از تن شاں جاں ربودن حکمت است

جز وکل کا رازداں خود سے غافل اور بے خبر ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری کے سبب سے انسان ہی انسان کا قاتل ہو گیا ہے۔ ''مارکس'' کے عنوان سے کہی گئی نظم کے اس

شعر میں یہی بات کہی گئی ہے ۔

رازدان جزو کل از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

سرمایہ و محنت کی ازلی کش مکش کو اقبال فطرت کے اس اصول کے مطابق بتاتے ہیں جس کے تحت مخالف اور متضاد چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

فطرتِ اضداد خیز لذتِ بے کار داد
خواجہ و مزدور را آمرو مامور را

''کوہ کن'' کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے جس میں کوہ کن کی زبان سے آسمان کو بادشاہ کی حمایت میں گردش کرتے ہوئے بتایا ہے۔ اگرچہ اس کے تیشے نے پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکال لی ہے ۔

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد
ہنوز گردشِ گردوں بکام پرویز ست

اب ذرا ان اشعار پر غور کیجئے ۔

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ بر و مند و جواں می بینم
کوہ را مثلِ پر کاہ سبک می یابم
پر کا ہے صنعتِ کوہ گراں می بینم
انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ نہ دانم کہ چاں می بینم

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہرِ نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

مارکسزم کا کوئی مشہور مبلغ شاعر سرمایہ دار اور مزدور کا اس سے بہتر تقابل مشکل ہی سے کر سکے گا۔ نظام سرمایہ داری سے مخالفت کے نقوش اقبال کے یہاں بہت پرانے ہیں۔ ''بانگ درا'' میں کہیں واضح اور کہیں کنایاتی انداز میں اس کا اظہار موجود ہے۔

اسٹالن نے کہا ہے کہ ''تمام حقوق مزدوروں کی ملکیت ہیں۔ اور کوئی دوسرا کسی قسم کا حق نہیں رکھتا۔'' اقبال اس نکتے سے بھی بخوبی آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ پودا جس کو مزدور خود اپنے ہی ہاتھوں سے لگاتا ہے۔ اور اپنے ہی خون سے سیراب کرتا ہے۔ اس کا پھل بھی مزدور ہی کا حصہ ہے۔ سرمایہ دار کا اس پر کوئی حق نہیں۔ چنانچہ اقبال مزدور کو اس حقیقت سے اس طرح آشنا کرتے ہیں۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اقبال کو مزدور کی سادگی اور بے سمجھی کا بھی افسوس ہے وہ حیران و پریشان ہیں کہ مزدور جس کا سب کچھ ہے وہ سرمایہ داروں کی غلامی میں مبتلا ہے ؎

وائے نادانی! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

☆

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گردِ غیر، بدن بھی گردِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

اقبال مزدور کا حامی ہے اس کے خیال میں سرمایہ دار کو مزدور کی محنت کا پھل حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اور سوشلزم کا مقصد بھی یہی ہے ؎

کارخانہ کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اُسے ناسازگار
حکم حق ہے **لیس للانسان الا ما سعی**
کھائے کیوں مزدور کی قسمت کا پھل سرمایہ دار

جمہوریت کے مغربی نظاموں میں سرمایہ داری کی خباثت سے جو نقص اور خلل واقع ہوا ہے اقبال کا ذہن اس کے متعلق بالکل صاف تھا ؎

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پرانے جھونپڑے میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

اقبال دنیا کی سماجی اور معاشی ناانصافیوں اور نابرابری کے شدید مخالف تھے۔ ان کو اس بات کا احساس شدت سے تھا کہ ایک بڑا طاقت ور طبقہ ایک کمزور اور معاشی اعتبار سے بچھڑے ہوئے طبقے کا استحصال کر رہا ہے اور مدت سے کرتا آرہا ہے وہ اس استحصال کو ختم کرنا چاہتے تھے یا ختم ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے انسانی استبداد کے نظاموں کو بہت قریب سے محسوس کیا تھا۔ ان کا حساس دل مظلوم، محروم اور غلام کی ہمدردی اور دلسوزی کے جذبہ سے بھرپور تھا۔ عالم اسلام کی غلامی سمند ناز پہ ایک تازیانہ تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ انہوں نے سرمایہ دار کو نصیحت کی۔ انہوں نے سامراج کو خبردار کیا۔ حتی کہ انہوں نے خدا تک سے شکوہ کیا۔ لیکن سچی انسانیت بیدار نہ ہوسکی اور ''عوامیت'' کے وہ طوفان اٹھنے شروع ہوئے جو بے حس اور

مستبد انسانیت کا ردعمل تھے۔ اشتراکیت اور اشتراکی انقلابوں کی گونج، سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

یورپ کی فرنگی تہذیب، سرمایہ دار نظام اور استحصالی جمہوریت کے اندر جس میں مزدور اور مظلوم کی کوئی موثر آواز نہ تھی جس میں اس کا کوئی بنیادی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ایسی طاقتوں کے زوال کے متمنی تھے اور جب ایک خطہ زمین پر سرمایہ دار مغلوب ہو گیا تو وہ خوشی سے پکار اٹھے ؎

گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

اور انہیں ظلمت شب میں امید کی ایک کرن نظر آئی ؎

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون

پھر خود ہی فرمان خدا کو پیش نظر رکھ کر پیش گوئی کرتے ہیں ؎

حکمت و تدبر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتی و قد کنتم به تستعجلون

اور پھر اقبال کارل مارکس کی زبان سے اس چیز کا اعلان بہ بانگ دہل کرتے ہیں کہ ؎

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش

سید اختر علی تلہری ان اشعار کے حوالے سے فرماتے ہیں :

''ان اشعار سے اقبال کا سرمایہ داروں سے تنفر اور مزدوروں سے اشتراکی رنگ کا شغف واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر اقبال کے لہجے میں کہیں اشتراکیت کا رنگ اور زیادہ شوخ طریقے پر نمایاں ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور نظم

میں انہوں نے انقلاب روس کے قائد لینن کو خدا کے حضور میں پہنچادیا ہے اور اس کی زبان سے سرمایہ داروں کے مظالم کی داستان چھیڑی ہے اور مزدوروں کی وکالت کرائی ہے۔ مزدوروں کی وکالت کے جوش میں خداوند عالم سے یہ سوال کیا ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

اور پھر خدا کی زبانی فرشتوں کے نام یہ قہرمانی آتشیں پیام جاری کردیا ہے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو

ان اشعار سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اقبال مارکسی مذاق کے تحت سرمایہ دار اور مزدور میں کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ سرمایہ داری کا سفینہ ڈوبتے دیکھنا چاہتے تھے اور اس لیے روز مکافات کے منتظر تھے۔

وہ اسے بھی درست طریقِ عمل سمجھتے تھے کہ قصر امراء کے درودیوار ہلا دیئے جائیں۔ اور نقشِ کہن بالکل ہی مٹا دیئے جائیں۔ جن کھیتوں سے کسانوں کو روزی حاصل نہیں ہوتی اس کے خوشہائے گندم ایک ایک کر کے جلا دیئے جائیں۔ اس قسم کا متشددانہ طرز عمل ''مارکسی اشتراکیت'' ہی کے دائرے کی چیز ہے''2

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال سرمایہ پرستی کے شدید مخالف تھے اور اسے معاشرے کے لیے لعنت سمجھتے تھے، وہ اس کے جلد از جلد خاتمے کے متمنی تھے۔ اس نظام نے اپنے کو انسانی اور اخلاقی اقدار سے مکمل طور پر بے نیاز کر کے انسانوں کو اپنا

غلام بنالیا تھا۔ اس نظام کا کام صرف غریبوں کو کچلنا اور ان کی محنتوں کے حاصل کردہ نتائج سے چند چالاک اور موقع پرست اشخاص کے لیے آسائشیں مہیا کرنا رہ گیا تھا۔ ظالمانہ نظام کی یہ صورت حال زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کی جاسکتی تھی اس کے خلاف ردعمل کا ہونا ناگزیر تھا۔ ''مارکسی اشتراکیت'' اس زوردار مد کا جز ثابت ہوئی اقبال اشتراکیت کی یہ نوعیت اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے مارکسی اشتراکیت کی افادیت کا اعتراف مختلف لہجوں میں کیا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کارل مارکس کی مذہب سے بے تعلقی کے باوجود اقبال نے کارل مارکس اور اس کی تصنیف ''سرمایہ'' کا ہر جگہ محبت وعقیدت سے نام لیا ہے چونکہ مارکس کے معاشی نظام میں مذہبی روحانیت کی آمیزش نہیں تھی اس لیے انہوں نے مارکس کو کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کے خطابوں سے یاد کیا ہے جو پیغمبر نہ ہونے کے بعد بھی صاحب کتاب ہے۔

ایں کلیم بے تجلی ایں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر، ولیکن در بغل دارد کتاب

یہی بات اقبال نے جاوید نامہ میں زیادہ واضح الفاظ میں کہی تھی اور صاحب سرمایہ یعنی مارکس، پیغمبر بے جبرئیل کا رشتہ ابراہیم خلیل اللہ سے جوڑا تھا۔ ان کے خیال میں مارکس کا اندازِ فکر تو کافرانہ تھا لیکن اس کا قلب مومن تھا۔ اور اس کے باطل خیالات بھی حق پر مبنی ہیں۔ اس میں جو خرابی ہے وہ بس یہی ہے کہ اس کا فلسفہ زندگی روحانیت سے خالی ہے اور اس کا سارا زور اس پر ہے کہ سب کو روٹی برابر ملے۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس

اقبال نے سوشلزم کے تصوّر کو کس حد تک قبول کیا تھا اس کا پتہ ان نظموں سے بھی چلتا ہے جو دراصل اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ لینن خدا سے سوال کرتا ہے ۔

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

پھر فرشتے گیت گاتے ہیں۔ اس میں بھی لینن ہی کے خیال کی تائید ہے۔ فرشتے خدا سے کہتے ہیں۔

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

مندرجہ بالا دونوں اشعار بھی مزدوروں کی برتری کو ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ ابھی بھی ان کے دکھ کے دن گئے نہیں ہیں اور یہ ہنوز کوچہ گرد ہے۔ اور اس کی گھات میں سبھی لگے ہوئے ہیں۔ پھر اقبال فرمانِ خدا کے ذریعے غریبوں کو بیداری کا ایک سحر انگیز پیغام دیتے ہیں اور اسے مکمل انقلاب کا نعرہ دیتے ہیں۔ سارے نقشِ کہن کو مٹا دینے کی تلقین کرتے ہیں۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے درو دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اردو میں اس سے زیادہ ہیجان انگیز اور ولولہ انگیز نظم آج تک نہیں کہی گئی۔ اس نظم کی سحر انگیزی میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ جذبے اور تاثیر سے بھرپور یہ نظم اشتراکیت کی وہ آواز ہے جسے اشتراکی ساری دنیا میں پہنچانا چاہتے ہیں اور اس پیغام کو بنی نوع انسان کے لیے عام کرنا چاہتے ہیں۔

اقبال کی اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ :

''یہ نظم کمیونسٹ مینی فسٹو کا لبِ لباب ہے اور محنت کشوں کے لیے انقلاب بلکہ بغاوت کی تحریک۔ جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے روسی زبان میں اگر اس کا موثر ترجمہ ہو سکتا اور وہ لینن کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ

بنانے پر آمادہ ہو جاتا۔3

خلیفہ عبدالحکیم نے کچھ غلط نہیں کہا ہے۔ بلکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اقبال کی اس نظم کے مقابلے میں کوئی بھی نظم ٹھہر نہیں سکتی۔ اتنے مختصر اور جامع پیرائے میں اشتراکیت کا بیان ممکن بھی نہیں۔

اب ان اشعار کو دیکھئے اس میں سرمایہ دار سامراج کے داؤں پیچ اور سرمایہ دار نظام کی تمام خوں خوار نزاکتوں کا طبقاتی کش مکش کے نقطہ نظر سے ذکر ہے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انسان کا پجاری ہے
مدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہان میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

ان اشعار کی روشنی میں اقبال کو اب آپ کیا کہیں گے؟ اقبال ہر ہر قدم پر مزدوروں کو محنت کش طبقہ کو حوصلہ دلاتے ہیں اور انہیں یقیں محکم کے ساتھ عمل پیہم کی تلقین کرتے ہیں اور بناتے ہیں جہد للبقا کے لیے یہ دو چیزیں ضروری ہیں اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو فتح یقینی ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

انقلاب روس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بے زار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ افکار

اس انقلاب کو وہ بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔ان کے خیال میں اب اس صبح کا ظہور ہونے لگا جس کے انتظار میں صدیوں کی سیاہ رات صبر وسکون کے ساتھ گذاری تھی۔

محنت کش کی زندگی پر چھائی ہوئی تاریک رات روشن صبح میں اس وقت تبدیل ہوئی جب مزدور کو اپنی اس قوت کا اندازہ ہو گیا کہ بادشاہ کو جو آسائش مہیا ہوتی ہیں وہ تو اسی کی محنت کا ثمر ہیں ۔

میکدے میں ایک دن ایک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا
اس کے آب الالہ گوں کی خوں دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے مرد غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

سکندر و قزاق کی یہ گفتگو ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ کس طرح یہ دونوں مل کر پوری دنیا میں ڈاکہ زنی، رہزنی اور قتل و غارت گری کا میدان گرم کیے ہوئے ہیں ۔اس میں سکندر کو قزاق کا جواب معنی خیز ہے اور وہ سکندر کی شخصیت پر روشنی ڈالتا اور اس کا پردہ فاش کرتا ہے ۔

صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

قزاق جواب دیتا ہے ۔

سکندر! حیف تو اس کو جواں مردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی
تیرا پیشہ ہے سفاکی میرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی

''خواجہ و مزدور'' کے عنوان سے اقبال نے بڑی ولولہ انگیز اور پُر تاثیر نظم لکھی۔ جس میں سرمایہ داری اور جاگیرداری ہی کے خلاف نہیں بلکہ مذہب کے ٹھیکیداروں کے خلاف بھی احتجاج کیا اور بتلایا کہ سرمایہ دار مزدور کے خون سے خالص لعل بناتا ہے اور زمین داروں کے ظلم سے کسانوں کی کھیتیاں برباد ہوتی ہیں۔ میں نے موجودہ زمانے کی بوتلوں میں وہ زہر دیکھا ہے جسے سانپ بھی چکھ لے تو تڑپ اٹھے لیکن اس کے باوجود وہ وقت آتا ہے جب کمزوروں میں شیروں کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ آج یہ ممکن ہے کہ پانی کے بلبلے سے شعلہ باہر نکل آئے۔ یہ سب انقلاب کا سامان ہے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک اپنے اندر زبردست انقلابی آہنگ رکھتی ہے۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور ساز ولعل ناب
از جفائے وہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

میر و سلطان نرد باز و کعبتین شاں دغل
جانِ محکومان زتن بردند و محکوماں بخواب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

شوخیٔ باطل نگہ اندر کمیں حق نشست
شپّر از کوری شبیخونے زند بہ آفتاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

در کلیسا ابنِ مریم را بہ دار او یختہ
مصطفےٰ از کعبہ ہجرت کردہ با ام الکتاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از دے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

با ضعیفاں گاہ نیروئے پلنگاں می دہند
شعلۂ شاید بروں آید زفانوسِ حباب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

شیخِ شہر از زشتہ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

اب اقبال کے کلام کی روشنی میں جائزہ لیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اقبال نے اشتراکی فلسفے کی تبلیغ و اشاعت بھرپور طریقے سے اپنے کلام کے ذریعے کی ہے۔ اور اشتراکی خیالات کو موثر طریقے سے دلوں میں اُتارنے کا کام جس حسن اسلوبی کے ساتھ اقبال نے انجام دیا ہے اُردو کے اور کسی شاعر نے انجام نہیں دیا۔ یہاں پر اقبال کا قد تمام شاعروں میں بلند ہے۔ سوشلزم کے تصور کی تبلیغ اقبال نے بالواسطہ اور براہِ راست بھی اُس وقت انجام دی جب نہ تو ہمارے ملک کے رہنماؤں میں کسی کو علاوہ حسرت موہانی کے اپنے کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ کہنے کی ہمت ہوئی تھی۔ اور نہ کسی پارٹی کے نصب العین میں سوشلزم کو جگہ ملی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کا قیام تو عمل میں آچکا تھا لیکن وہ غیر قانونی تھی۔ اور اس کے بیش تر ممبر قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایسے میں سوشلزم کے خیالات کی تبلیغ اور وہ بھی کھلم کھلا بڑے دل گردے کی بات تھی۔ لیکن اقبال نے تمام بندشوں کے باوجود حق وصداقت کی آواز کو بلند کرنا اپنا فرض سمجھا اور وہ اس کو نبھاتے رہے۔

اقبال نے انقلاب کے نغمے ضرور گائے ہیں مارکس اور لینن کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ہر جگہ ان کا مخصوص انداز نظر قائم ہے۔ کیوں کہ وہ اشتراکیت کے معاشی نظام میں روحانیت کی آمیزش کے قائل تھے۔ اشتراکی انقلاب میں بھی انہیں خودی کی بے داری نظر آرہی تھی اس لیے اقبال نے اس انقلاب کی انقلابی لے کو تیز کرنے کی کوشش کی۔ روس ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں وہ اِس انقلاب کو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

جہاں تک اقبال کے معتقدین کا خیال ہے تو ان کا ماننا ہے کہ مارکس اور

اقبال کی تعلیمات کے درمیان اختلافات محض فروعی ہیں۔ دونوں موجودہ سیاسی اور سماجی تقاضوں سے بے زار ہیں۔ دونوں ہزار ہا سال کی لُٹی پٹی جنتا کی زبوں حالی کو محسوس کرتے اور اُسے روشن مستقبل کا پیام دیتے ہیں اور دونوں نکمّے عیش پرست سرمایہ داروں کو سماج سے خارج کرنے کے لئے مضطرب ہیں۔ دونوں مظلوموں کی فریاد سنتے ہیں اور ان کی بھلائی کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ ان دونوں کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ تھا اس انسان کش اور شرمناک نظام کا خاتمہ اور ہوس پرستوں سے غریب اور لاچار عوام کو بچانا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مارکس غریب مزدوروں اور کسانوں کی اقتصادی اغراض کے لئے منظّم جدوجہد کے قائل تھے جب کہ اقبال اس کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ اور نہ ہی وہ اس نفسیاتی رمز سے ہی آشنا تھے کہ مغضوب طبقوں کی اقتصادی برابری ہی انہیں ایک زبردست انقلابی قوت بناتی ہے۔ اشتراکیت اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے اقتصادی انصاف کی ضروری شرط قرار دیتی ہے۔ جبکہ اقبال کے یہاں مطلوبہ اقتصادی اور سیاسی نظام کا تصور بہت ہی مبہم ہے۔ دراصل وہ سرمایہ داری اور جمہوریت سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ ان کی تمام ذہنی قوت تخریبی فکر ہی میں صرف ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ تعمیری فکر کے نقوش ان کے یہاں بہت دھندلے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مزدوروں، کسانوں اور محکوم ممالک کے تمام مغضوب انسانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک موقع پر انہوں نے کارخانہ داروں میں انسانی ہمدردی کے فقدان کا یوں ذکر کیا ہے۔

تختہ دکاں شریک تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
برزبانش خیر و اندر دل شر است

کشتن بے حرب و ضرب آئین او
مرگہا در گردشِ ماشین او

حواشی

۱۔ دیباچہ۔ پیام مشرق۔

۲۔ فکر اقبال۔ خلیفہ عبدالحکیم

۳۔ نئی روشنی۔ دلی یکم مئی ۴۹ ص ۱۱

نقدِ اقبال کا مطالعہ

اُردو میں جن دو شاعروں پر سب سے زیادہ لکھا گیا اُن میں ایک اقبالؔ اور دوسرے غالبؔ ہیں۔ اُردو کے تقریباً تمام اہم نقادوں نے ان دونوں کی شخصیت اور فکر وفن پر تحقیقی اور تنقیدی توجہ اس قدر دی ہے کہ اقبالیات اور غالبیات باقاعدہ ایک شعبہ بن چکا ہے۔ یہ مقبولیت ان دونوں کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور آئے دن اقبال کو نت نئے انداز سے پرکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اقبال کی اس تفہیم وتشریح سے اقبال کے نئے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں اور اقبال کی تفہیم میں آسانی کے بجائے دشواری ہوتی جارہی ہے۔ ہر روز اقبال ایک نئی شکل میں سامنے آرہا ہے اور اُس کی شخصیت مزید پیچیدہ اور گنجلک ہوتی جارہی ہے۔

ہر بڑی شخصیت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت اتنی لچک دار ہوتی ہے کہ ہر آدمی اُسے اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ناقدین ادب نے اقبال کو اپنے اپنے سانچے میں ڈھالا ہے اور اپنے خیال کی تردید میں ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناقدین ادب کا یہ زخیرہ اقبالیات پر باضابطہ ایک اسکول بن چکا ہے۔ اُردو ہی کے نہیں بلکہ دوسری بہت سی زبانوں کے (بہ شمول انگریزی) معتبر ناقدین ومحققین کی بے شمار تصنیفات اقبالیات میں گراں بہا اضافے کا سبب بنی ہیں۔ لیکن بقول ڈاکٹر عبدالحق

''جب ہم اقبالیات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو اکثر حیرت و استعجاب کے ساتھ مایوسی ہوتی ہے۔ بیشتر ناقدینِ اقبال نے حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ ہمہ گیر آفاقی اصولوں سے بے اعتنائی برتی ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اقبالیات سے مراد وہ تصانیف ہیں جو قابل اعتناء ہیں ورنہ اقبالیات کا دو تہائی حصہ محض رطب و یابس ہے'' 1

یہ حقیقت ہے کہ نقد اقبال میں نہ صرف یہ کہ حقائق سے چشم پوشی ہوئی ہے بلکہ اکثر ناقدین اقبال نے پچھلی باتوں کو نئے اُسلوب میں دُہرا کر ''ماہر اقبال'' کی سند حاصل کر لی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہاں میں بھی اس بات کی وضاحت کر دوں کہ ناقدینِ اقبال سے میری مراد وہ ناقدین ہیں جنہیں ہم ماہرِ اقبال کی حیثیت سے تسلیم کر چکے ہیں۔ اور جن کا فرمایا ہوا ایک ایک لفظ اقبال کی بابت مستند سمجھا جاتا ہے۔ (گرچہ اختلاف کی گنجائش پھر بھی باقی رہتی ہے)۔

اقبال پر اس قدر لکھے جانے کے باوجود اقبال اور اشتراکیت پر کوئی مربوط اور منضبط تحریر وجود میں نہیں آئی۔ جو اقبال کے اس پہلو کو تسلی بخش طور پر اُجاگر کر سکے اور فکر اقبال کے اس گوشے کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ پھر بھی اس صورت حال میں اقبال اور اشتراکیت کے تعلق سے جو کچھ بھی کام ہوا ہے میں اُس کا جائزہ پیش کر رہا ہوں تا کہ فکر اقبال کا یہ گوشہ منور ہو سکے۔

جگن ناتھ آزاد نے ''اقبال اور مارکس'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو اس بحث کا کسی قدر تفصیلی احاطہ کرتا ہے۔ عبدالرحمٰن طارق نے بھی اپنی تصنیف ''جوہر اقبال'' میں اقبال اور سرمایہ داری کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ بشیر احمد ڈار نے A study in Iqbal philosophy میں ایک پورا باب Iqbals conception of society کی وضاحت میں صرف کیا ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل اس باب کو اسلام کی جماعت یا

سوسائٹی سے متعلق نظریات کی بحث میں ہی تمام کر دیا گیا اور قاری اسی انتظار میں رہا کہ جماعت سے متعلق اقبال کے نظریات پر بھی کچھ روشنی پڑے۔

عبدالسلام ندوی، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالغنی نے بھی اقبال اور اشتراکیت پر تفصیلی بحث کی ہے۔ نقد اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے اُس خط کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو انہوں نے ''زمیندار'' کے مدیر کو بالشویک خیالات'' سے نسبت کی تردید میں تحریر کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو خطوط اقبال کا تجزیہ) کہ بیش تر ناقدین نے اقبال کے انہیں خیالات کو اپنی زبان دے دی ہے۔ جو خط مذکور میں علامہ اقبال نے بیان کیے ہیں۔

عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:۔

''قرآنی تعلیمات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب اخلاقی حیثیت سے بھی اشتراکی تحریک کی تائید کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان تقسیم مال کا جو غیر مساویانہ طریقہ جاری ہے وہ سخت ظالمانہ ہے اور اس پر انہوں نے نہایت پُرتاثیر نظمیں لکھی ہیں۔'' 2

اس طرح ندوی صاحب کا خیال ہے کہ اشتراکی تحریک کی تائید اخلاقی اعتبار سے تو درست ہے ہی قرآنی تعلیمات کے مطابق بھی ہے۔ لیکن بعد میں ندوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اقبال اس تحریک کے بعض بنیادی اصولوں سے اتفاق نہیں کرتے۔ کیوں کہ یہ خالص ملحدانہ تحریک ہے۔ چنانچہ وہ مزید لکھتے ہیں:۔

''بہرحال اشتراکیت ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا ایک دلچسپ موضوع ہے اور انہوں نے بال جبرئیل وغیرہ میں اس کی تائید میں اس قدر پُرجوش نظمیں لکھی ہیں کہ وہ بظاہر سوشلسٹ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن باایں ہمہ وہ اس تحریک کے بعض بنیادی

اصولوں کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ خالص ملحدانہ تحریک ہے۔ جس کی بنیاد خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی پر قائم ہے۔ اس لیے جہاں تک نتائج کا تعلق ہے اشتراکیت اور ملوکیت میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں بندۂ زر اور بندۂ شکم ہیں۔'' 3

گویا عبدالسلام صاحب کے خیال میں اشتراکیت اقبال کی شاعری کا دلچسپ موضوع تو ہے اور اس کی تائید میں پُر جوش نظمیں لکھنے پر وہ بظاہر سوشلسٹ بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اقبال اس تحریک کے بعض بنیادی اصولوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا تعلق الحاد سے ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال اور اشتراکیت کا جائزہ لیتے ہوئے اشتراکیت کی طرف اُن کے جھکاؤ کو اُن کا طبعاً انقلاب پسند ہونا قرار دیا ہے۔ اور انقلابی انسان جس طرح ہر انقلابی تحریک کا جائزہ لیتا اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو پرکھتا ہے اِسی طرح اقبال نے بھی اشتراکیت کو جانچا اور پرکھا ہے۔ ان کے مطابق اس میں اقبال کے شعور و ادراک کو اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ اُن کی انقلابی طبیعت کا تھا۔ اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم رقمطراز ہیں:۔

''اقبال ... نے مذہب و تہذیب کے تمام مسائل کو اپنا موضوع سخن بنایا تو یہ لازم تھا کہ اشتراکیت کے فطری اور عملی پہلوؤں پر غور کر کے اپنے نتائجِ فکری سے ملت کو آگاہ کرے۔ سب سے پہلے پیامِ مشرق میں اس کے متعلق رائے زنی شروع کی۔ اقبال طبعاً انقلاب پسند تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس انقلابِ عظیم کو اچھی طرح پرکھے اور اس کے تعمیری اور تخریبی پہلو اور اس کی ایجابی و سلبی حیثیتوں کا موازنہ و مقابلہ کرے۔'' 4

اور جب اقبال اس انقلابِ عظیم کے تعمیری و تخریبی پہلوؤں کا موازنہ و مقابلہ کرنے کے بعد ''فرمان خدا'' (فرشتوں سے) ایسی نظمیں لکھتے ہیں تو بقول خلیفہ عبدالحکیم اس کا روسی ترجمہ کر کے لینن کو سنا دیا جاتا تو وہ اِسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ بنانے پر آمادہ ہو جاتا۔ اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:۔

''بالِ جبرئیل کی ایک دوسری نظم فرشتوں سے ''فرمان خدا'' ایسی ہیجان انگیز اور ولولہ خیز ہے کہ اس کے جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے اگر روسی زبان میں اس کا موثر ترجمہ ہوسکتا اور وہ لینن کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اُسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ بنانے پر آمادہ ہو جاتا۔ 5

خلیفہ عبدالحکیم ان ہی الفاظ پر بس نہیں کرتے بلکہ مذکورہ نظم کے بارے میں مزید رقمطراز ہیں:۔

''یہ نظم کمیونسٹ مینی فیسٹو کا لب لباب ہے اور محنت کشوں کے لیے انقلاب بلکہ بغاوت کی تحریک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے تمام معاشی پہلوؤں سے اتفاق رائے رکھتے تھے۔ سوا اس کے کہ اس تمام تنظیم جدید نے انسان کے دل و دماغ پر یہ غلط عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ تمام زندگی مادّی اسباب کے عادلانہ یا مساویانہ تقسیم سے فروغ اور ترقی حاصل کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال انسانی زندگی کا مقصود جسمانی ترقی نہیں بلکہ روحانی ترقی سمجھتے تھے۔ 6

ندوی صاحب خود اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ اقبال نے اشتراکیت کو عقل و شعور کی روشنی میں جانچتے اور پرکھنے کے بعد اس کے تمام معاشی پہلوؤں سے اتفاق کیا۔

اقبال نے سرمایہ داری اور اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نظام کو دونوں کے مقابلے میں افضل بتلایا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا کہنا ہے کہ اقبال کا اسلامی نظام کو افضلیت دینا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس کا جواز پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

''اقبال کے تمدنی تصورات چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تعلیم سے ماخوذ ہیں اس لیے محل تعجب نہیں کہ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے معیشت کے اسلامی نظام کو اِن دونوں پر فضیلت دیتا ہے۔'' 7

اقبال کے تمدنی تصورات بنیادی طور پر اسلامی تعلیم سے ماخوذ ہونے ہی کو بنیاد بناتے ہوئے یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:۔

''اقبال اشتراکیت کے بعض اصول کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اُنہیں اسلامی تعلیم کے مطابق خیال کرتا ہے۔ تقسیم دولت میں جہاں تک ممکن ہو مساوات ہونی چاہئے تاکہ ہر فرد و بشر کو اپنی صلاحیت کے بموجب ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔

اقبال نے مارکس اور لینن کی انقلابی مساعی کو سراہا ہے اور اُن دونوں کی عظمت کو تسلیم کیا اس لیے نہیں کہ وہ اُن کے خیالات سے متفق تھا بلکہ اس لیے کہ وہ خود بھی سرمایہ داری کے خلاف اور انقلاب کا علم بردار تھا۔'' 8

عبدالرحمٰن طارق کے خیال میں.....

''علامہ اقبال کسی خاص فرد (یہ اشارہ مارکس کی طرف ہے) یا قوم کے دستور معیشت یا آئین اقتصادیات سے بالکل بالا و بے تعلق رہتے ہوئے سرمایہ و محنت کی کش مکش اور ہر معاشی ظلم و

بدنظمی کو صرف معیار فطرت اور اصول عدل و انصاف سے رفع کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اسلام کا نظام معیشت فطرت سے سو فیصدی ہم آہنگ ہے اور اصول و انصاف کا بہترین و مکمل مظہر، لہٰذا وہ عہد حاضر کی تمام بے اعتدالیوں اور سرمایہ و محنت کے اختلافات و مناقشات کو قرآن و اسلام ہی سے حل کرنے کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔'' 9

اقبال کی شاعری میں محنت کش و سرمایہ دار طبقے کی باہمی کش مکش کا حال نظم ہوا ہے اس کے بارے میں عبدالرحمٰن طارق کا کہنا یہ ہے کہ ان اشعار یا نظموں میں:۔

''سرمایہ دار کی گوناگوں چیرہ دستیوں، حق تلفیوں اور فریب کاریوں کے خلاف احتجاج بھی ہے اور حقوقِ مزدور کی منصفانہ حمایت و ترجمانی بھی، جاگیرداری اور ہوس زمین کی شدید مذمت بھی ہے، حامیانِ مزدور کے ولولہ انگیز نعرے بھی ہیں۔ ہمدردانِ محنت و مشقت کی پُرخلوص و دردمندانہ صدائیں بھی ہیں۔ انسانیت کے خفتہ و پس ماندہ طبقوں کو اپنے جائز حقوق زندگی کی تحصیل و تسخیر کے لیے بیدار و مستعد ہونے کی تلقین بھی ہے اور اصلاح معاشیات کے لیے تعلیمات قرآن پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بھی۔'' 10

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کا خیال ہے کہ کلام اقبال میں جہاں کہیں بھی اشتراکیت کی تائید و حمایت نظر آتی ہے اُس کا اصل سبب یا محرک:۔

''ایک تو وہ عام دردِ انسانی ہے جو اقبال کی شخصیت میں بدرجۂ وافر ودیعت کیا گیا تھا دوسرے حالات حاضرہ پر اُن کی گہری نظر اور تیسرے اُن کی بصیرت یا فراست ایمانی جس کی بدولت

اُنہوں نے ۱۹۰۷ء میں یہ شعر کہے تھے ۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا

آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ روس میں اتنا بڑا انقلاب برپا ہو جائے اور اقبال سا حساس فنکار اس سے بالکل متاثر ہی نہ ہو لیکن متاثر ہونا اور بات ہے اور نظریہ اور عقیدہ اس کی نذر کر دینا دوسری بات اقبال اس انقلاب سے صرف متاثر ہی ہوئے ہیں اور متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے اور انقلاب روس نے بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کو اپنا نشانہ بنایا ورنہ جہاں تک مارکس کے نظریۂ اشتراکیت کا تعلق ہے اقبال کے لیے اس نظریئے کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایک اشتراکی کے لیے خدا، روح اور مذہب تینوں سے انکار لازمی ہے۔'' 11

پھر آگے چل کر اُسی مضمون میں اپنی باتوں کی حمایت میں مزید لکھتے ہیں.....

''اقبال سرمایہ داری کے خلاف مزدور کی بغاوت سے تو خوش تھے لیکن اشتراکی نظام حکومت پر اُن کا قطعی ایمان نہیں تھا۔ اقبال کے جن اشعار یا نظموں کو لے کر انہیں یا اُن کی روح کو اشتراکی کے لقب سے نوازا جا رہا ہے وہ نظمیں ایک تو اُس جذبۂ بغاوت کا نتیجہ ہیں جو اقبال کے دل میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف سلگ رہا تھا۔ دوسرا انسان دوستی کا۔ اقبال چونکہ عملی طور پر

سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے اور عملی سیاست میں انہیں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا تھا اس لیے اُن کی شاعری میں یہ دبی ہوئی آگ اور تیزی سے بھڑکی ہے۔'' 12

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد اقبال کو کسی بھی صورت میں اشتراکی ماننے کو تیار نہیں وہ صرف اتنا مانتے ہیں کہ اقبال اس نظریئے سے متاثر ضرور تھے۔ اور متاثر ہونے کی وجہ ان کے نزدیک اقبال کا بذات خود سرمایہ داری اور ملوکیت کے خلاف ہونا ہے۔ اور اشتراکیت بھی اس کی مخالف ہے لہٰذا اس خیال کی مطابقت نے اقبال کو کسی حد تک متاثر کیا۔ لیکن وہ اس نظام حکومت پر ایمان نہیں لائے۔ بلکہ آخر آخر تک اس کی مخالفت کرتے رہے۔ اب رہیں اقبال کی وہ نظمیں جن کی وجہ سے انہیں یا اُن کی روح کو اشتراکی کے لقب سے نوازا جارہا ہے تو وہ خود اقبال کی ذاتی بغاوت کا نتیجہ ہے جو سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف اُن کے دل میں تھا۔ اور یہی خوبیاں جو اسلام سے مماثلت رکھتی ہیں اُن کو بہتر نظر آئیں۔ ورنہ مارکسزم کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اپنے خیال کی تائید میں مزید لکھتے ہیں:۔

''اقبال کو مارکسزم یا نئے روس میں جو خوبیاں نظر آئیں وہ یہ ہیں کہ یہ نظام ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے اور اس میں محنت کش طبقے کے لیے مواقع موجود ہیں ورنہ مارکس کی جدلیاتی مادّیت سے اقبال کو شدید اختلاف ہے۔'' 13

اقبال نظام کی تبدیلی تو چاہتے تھے لیکن اُس کی بنیاد اسلام ہو وہ ایسا نظام چاہتے تھے جو مادّیت کے بجائے روحانیت پر یقین رکھتا ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس میں ہر قسم کی نابرابری اور عدم مساوات کا خاتمہ ہو جس طرح مارکسزم میں ہے۔ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:۔

''اقبال مارکسزم کی جگہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں ملوکیت، سرمایہ داری اور طبقہ واری کش مکش تو اُسی طرح ناپید ہوں جس طرح مارکسزم میں ناپید ہیں۔ لیکن اُس کی بنیاد رُوحانیت ہو مادّیت پر نہ ہو اور ایسا نظام اقبال کو صرف اسلام ہی میں نظر آتا ہے۔'' 14

لیکن تمام باتوں کے علاوہ جگن ناتھ آزاد اتنا تو مانتے ہی ہیں کہ اقبال اشتراکیت سے متاثر تھے اور اس کے اقتصادی اور غیر طبقاتی نظام کو بہ نظر تحسین دیکھتے تھے۔ اور وہ رُوحانیت کی آمیزش کے ساتھ اسی قسم کا انقلاب چاہتے تھے۔

علی سردار جعفری اقبال کو اشتراکیت کا مبلغ اعلا تو نہیں لیکن مزدوروں کا ہم درد اور ہم نوا ضرور مانتے ہیں۔ لینن کی تعلیمات میں انہیں رُوحانیت کی کمی کے باوجود اچھائیاں نظر آئیں لکھتے ہیں:۔

''جب سنہ ۱۹۱۷ء میں انقلابِ روس ہوا اور دنیا کے ایک چھٹے حصے میں مزدور طبقے نے سامراج اور سرمایہ داری کا تختہ اُلٹ دیا تو اقبال نے آنکھیں کھول کر اس نئی روشنی کو دیکھا جس کے دور کا آغاز مشرق و مغرب میں ہو رہا تھا۔ اور بطن گیتی سے ''آفتاب تازہ'' کی بشارت دی اقبال ہندوستان کے اُن پہلے دو تین شاعروں میں ہیں جنہوں نے انقلاب روس کا خیر مقدم کیا۔ پہلی بار اقبال کی شاعری میں انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے معنوں میں آیا اور مزدور اور سرمایہ دار کے تضادات کا اظہار ہوا اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا تضاد۔'' کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار''۔ اقبال نے اِن تصورات کو لے کر اُن میں بھی روحانیت شامل کر دی جس کا اظہار اُن کی نظم ''لینن خدا

کے حضور میں'' اور دوسری نظموں میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال انقلاب کی دعوت دیتے ہیں (خواجہ از خونِ رگ مزدور ساز ولعل ناب/از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب/انقلاب اے انقلاب) اور انقلاب سے گھبراتے بھی ہیں۔ (ز ،م،ا، اگر مزدور کے ہاتھوں میں آجائے/طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی) یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مارکس اور لینن کی تعلیمات میں سچائی ہے۔ اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں، کہ اُن میں رُوحانیت کی کمی ہے۔'' 15

آگے چل کر حاشیہ میں مزید لکھتے ہیں:۔

''آخر آخر میں اقبال اشتراکیت کی طرف زیادہ مائل ہونے لگے تھے اور اشتراکی روس کی ترقی سے متاثر ہو رہے تھے۔ جس کا پتہ اُن کی بعض نظموں سے لگتا ہے۔ (بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار) انہوں نے سنہ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں سبط حسن سے بھی اشتراکیت کے حق میں کچھ کہا تھا۔'' 16

علی سردار جعفری کی نگاہ میں اقبال انقلاب روس کو ایک خوش آئند انقلاب سمجھتے تھے۔ اور اسے نئے جہاں کی تعمیر میں ایک بہتر قدم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عمر کے آخر حصے میں وہ اس کی طرف کچھ زیادہ مائل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی بھی اقبال کو اسلام کا اور انسانیت کا شاعر مانتے ہیں وہ اقبال کو ایک لمحے کے لیے بھی اشتراکی ماننے کو تیار نہیں وہ اقبال کی تمام شاعری کو صرف اسلام کی تبلیغ واشاعت اور خوابیدہ مسلمانوں کی بےداری کا زبردست آلہ سمجھتے ہیں۔ اِن کے مطابق اقبال کی شاعری جوش وجذبے سے بھرپور ایک ایسی شاعری ہے جو ملتِ خوابیدہ کو بیداری کا پیغام دے رہی ہے۔ اقبال اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں

میں جاری و ساری دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس لیے وہ اسلامی انقلاب چاہتے ہیں۔ اور اُن کی تمام تر جدوجہد کھوئے ہوئے کی سرگزشت ہے۔ ایسے میں انہیں اگر کہیں سے انقلاب کی کوئی جھلک نظر آتی ہے تو وہ اُس میں اسلامی انقلاب کے خدوخال ڈھونڈھنے لگتے ہیں اقبال نے اشتراکیت کا استقبال صرف اس لیے کیا ہے کہ اُس میں اُنہیں کچھ چیزیں اسلامی فکر سے میل کھاتی ہوئی نظر آئیں۔ اور انھوں نے سمجھا کہ وہ حقیقت جو حرف ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے شاید اشتراکیت کے ہاتھوں نمودار ہو۔ لکھتے ہیں:۔

''حقیقت صرف اتنی ہے کہ اقبال کو مارکس اور لینن کی تعلیمات کے چند اُن اجزا سے بڑا تعلق خاطر ہے جو اسلامی فکر سے میل کھاتے ہیں۔ بلکہ اقبال کے نزدیک اِسی سے مستعار ہیں سب سے بڑھ کر وہ اشتراکیت کے تاریخی رول سے متاثر ہیں وہ مغرب کی چیرہ دست ملوکیت اور کلیسا کے فرسودہ اخلاق کے خلاف اس کے جرأت مندانہ اعلانِ انقلاب سے بہت پُر اُمید ہیں۔ وہ اُسے مغرب کی سرد و جامد فضا میں حرارت حیات اور تازہ کاری کی علامت سمجھتے ہیں۔ انہیں اس کے اس فلسفہ مُساوات اور حمایت غرباء کے اعلان میں اسلام کا تاریخی کردار یاد آجاتا ہے۔ وہ اس کی مادّی بنیادوں کی سخت تردید کرتے ہوئے بھی کسی وجہ سے اس بات کے متوقع ہیں کہ شاید اس دور میں وہ حقیقت جو حرف ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اشتراکیت کے ہاتھوں نمودار ہو۔''17

ڈاکٹر مغنی کے خیال میں اشتراکیت کی طرف اقبال کا جھکاؤ اپنے نصب العین کو بروئے عمل آتے ہوئے دیکھنے کے لیے ہے۔ ان کی روح بے قرار و پریشان

ہے اور وہ ایک ایسی سرزمین کی تلاش میں ہیں۔ جو دنیا سے خواب آور افکار کے طلسم کو توڑ سکے۔ جو مغرب نے ایک عرصے سے اقوام عالم کے گرد بن رکھا ہے۔ ایسے میں اگر انہیں کہیں اس جرأت اندیشہ کی ایک لہر بھی نظر آتی ہے تو وہ فوراً اس سے اپنی توقعات وابستہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اشتراکیت سے اُن کی وابستگی اس توقع سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ایک دوسرے مضمون میں اشتراکی انقلاب کے خیر مقدم کی وجہ یوں بیان کی ہے۔

''اقبال کے سامنے نقشہ یوں تھا کہ ایک طرف اہل کلیسا کا اقتدار پوری انسانیت پر ظلم کر رہا تھا اور دوسری طرف تمام بنی آدم مظلوم تھے۔ اس صورت حال میں روس کے اُفق سے اشتراکیت اُبھری اُس نے ایک طرف کلیسا کی غارت گری کو چیلنج کیا، تو دوسری طرف عام حریت اور مساوات انسانی کا دعویٰ کیا چنانچہ اقبال نے جو ایسی ایک تحریک کے منتظر تھے اور خود اپنی حدود میں ایک انقلاب کا راستہ ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ نہایت پُر جوش طریقے پر اور بڑی توقعات کے ساتھ اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ کارل مارکس کی آواز، اشتراکیت، فرمان خدا، سرمایہ و محنت، بالشویک روس، جیسی نظمیں لکھیں۔ یہاں تک کہ جاوید نامہ میں جمال الدین افغانی سے ''ملت روسیہ'' کو ایک پیغام دلوا دیا۔''18

اپنے ایک دوسرے مضمون میں اشتراکیت کے استقبال کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں.....

''چونکہ یہ نظریہ اخلاقی سطح پر مسیحی کلیسائیت کے سیاسی اعتبار سے

استبدادی قوتوں کے لیے زبردست چیلنج بن کر سامنے آیا اس لیے اقبال نے محسوس کیا کہ اس کی وقتی کامیابیوں سے اہل کلیسا کا زور ٹوٹے گا اور زمین ایک بہتر نظریئے کے لیے صاف اور ہموار ہو سکے گی۔ دوسرے معاشی عدل وانصاف کا جو مجرد تصور اپنے ابتدائی دور میں، سوویت روس نے پیش کیا تھا وہ اقبال کو رائج الوقت نظاموں کی بہ نسبت اسلام کے معاشی نظام سے قریب تر نظر آیا''19

چلیے اقبال نے الحاد و دُہریت کے باوجود اشتراکیت کا خیر مقدم کیا تو سہی۔ چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ آخر اس تاریکی میں روشنی کی کرن انہیں وہاں نظر تو آئی۔ مایوس اور نا اُمید دلوں کو اُمید اور حوصلے تو ملے جو انہیں اس انقلاب سے قبل اور کہیں نظر نہ آیا۔ مردہ عزائم اور پست حوصلگی کو ایک تحریک تو ملی۔ سویا ہوا انسان بیدار تو ہوا۔ اور اُسے کھوئے ہوئے کی جستجو تو ہوئی۔ اِن تمام باتوں کے علاوہ میرے خیال میں اشتراکیت کی طرف اقبال کا جھکاؤ سرمایہ اور محنت کے درمیان اُس شدید بے انصافی سے تھا جو ساری دنیا کو اپنا غلام بنائے ہوا تھا۔ دوسری وجہ ملوکیت کی تھی جس کا غلبہ ساری دنیا پر تھا۔ سرمایہ اور ملوکیت اِن دونوں نے مل کر غریب اور مزدور کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اقبال بنیادی طور پر اِن دونوں کے خلاف تھے۔ اور وہ سوشلزم کے قائل تھے۔ اور یہ خوبی اُنہیں اشتراکیت میں نظر آئی۔ باوجود اُس کی مادّیت کے قائل نہ ہونے کے اقبال نے اس کو بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ اور اس سے اپنی اُمیدیں وابستہ کر دیں۔ محنت کشوں کو ظلم و جور کے پھندوں سے آزاد کرانے اور اُن کو انصاف دلانے کے لیے اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ جس کا بنیادی مقصد غیر طبقاتی نظام کے قیام کا تھا۔ اور یہ نظام مزدوروں کا نظام تھا خود ڈاکٹر عبدالمغنی بھی اس بات کے قائل ہیں لکھتے ہیں کہ:۔

''اقبال کو نہایت گہری ہمدردی پسماندہ عوام کے ساتھ بھی ہے اُنہیں دنیا کے تمام محنت کشوں سے محبت ہے وہ اُن کی مصیبتوں پر سخت رنجیدہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کوئی انقلاب ایسا رُونما ہو جو مزدوروں کو سماج میں اُن کی حقیقی جگہ دلا دے۔ اقبال انسانی شرف و مساوات کے شدت کے ساتھ قائل ہیں وہ معاشی بلندیوں اور پستیوں کو ایک فطری چیز سمجھتے ہیں لیکن اُس کی بنا پر سماجی بلندی و پستی کو قطعی غلط اور مصنوعی قرار دیتے ہیں۔

اقبال کا مقصود یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ایسی اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو کہ مزدور کو بھی اپنی شخصیت کے ارتقاء کے ویسے ہی مواقع حاصل ہوں جیسے سرمایہ دار کو ہوں''۔ 20

اور دولت کی تقسیم ایسی ہو کہ:

''کم سے کم ضروریات ہر شخص کی بہ آسانی پوری ہو سکتی ہوں یعنی بہ حیثیت مجموعی معاشی نظام انصاف پر مبنی ہو'' (۲۱)

اور اقبال کی یہ تمام فکر اشتراکیت سے مکمل طور پر میل کھاتی ہے اور اشتراکیت اقبال کی ان تمناؤں کو پوری کرتی نظر آتی ہے۔ اس لیے اقبال اشتراکیت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے علمبردار ضرور ہیں لیکن اسلامی انقلاب کے لیے راہ ابھی ہموار نظر نہیں آ رہی ہے اور ان کے مقصد کا حصول اشتراکی انقلاب سے بہت حد تک پورا ہوتا نظر آتا ہے اس لیے اقبال اس کا پُر جوش استقبال کرتے ہیں۔ اسلامی فکر کے باوجود وہ اشتراکیت کے قائل ہیں۔ وہ فلسفۂ جدلیت کے بھی قائل ہیں اور انہوں نے اس سے بھی بہت حد تک اثر قبول کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں لکھتے ہیں:۔

''لینن نے بھی اقبال کو کافی متاثر کیا ہے اس ضمن میں انہیں

ہیگل کے فلسفۂ جدلیت سے بھی اس انداز میں مناسبت معلوم ہوتی ہے کہ مطلق محاربت ایک قانونِ ارتقاء ہے جس کو انہوں نے رزمِ خیر وشر کا نام دیا ہے اِس سے زندگی آگے بڑھتی ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی'' 22

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ''اقبال شناسی کے کچھ پہلو'' پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اصلی اقبال دراصل وہ اقبال ہے۔

''جس اقبال نے انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کی ترجمانی کی ہے، جس نے انسانی محنت کے استحصال کے خلاف غصے کا اظہار کیا ہے، اور ایک منصفانہ نظام قائم کرنے کے لیے عمل آرا ہونے کی تلقین کی ہے وہی اصلی اقبال ہے۔ باقی سارے اقبال، اس اصلی اقبال کے ارتقاء کی منزلیں ہیں''23

ان کا اشارہ بھی اقبال کی اس فکر کی طرف ہے جس میں اقبال نے غیر منصفانہ نظام کو ختم کر کے منصفانہ نظام قائم کرنے کی نہ صرف تلقین کی ہے بلکہ نظام جبر کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے میدان عمل میں کود پڑنے کی بھی ترغیب دی ہے۔ اس لیے کہ بقول کمال احمد صدیقی۔

حرکت اور عمل میں انہوں نے نظام جبر بدلنے کا راستہ دیکھا کیوں کہ اس بات کا انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ''پرامن'' طریقے سے مفاد خصوصی رکھنے والے حکمراں، حکمرانی سے دستبردار نہیں ہوگے مارکس (آل کلیم بے تجلی) نے انہیں اپنی طرف کھینچا اور مارکس کا نظریہ انہیں اتنا بھایا کہ ان کی فکر میں اس کی دھاری آئی۔ انسانی محنت کے استحصال کو ختم کرنے کے لیے اس کا

نظریہ انہوں نے اسلام کی تعلیمات سے قریب ترین پایا۔ انہوں نے مارکس کو پیغمبر نہیں مانا لیکن ''داس کیپٹیل'' کو کتاب تسلیم کرنے میں انہوں نے کوئی جھجک نہیں محسوس کی۔ بعد میں جب روس میں انقلاب آیا، اور اس وقت وہ پان اسلامی تحریک کے حامی تھے، تو انہوں نے اسلام کے دستور اساسی اور بالشوزم میں مماثلتیں دیکھیں۔ یہ محض اتفاق نہیں، اور ..... اقبال نے ایک فارمولہ بھی بنایا: بالشوزم + خدا کا تصور = اسلام'' 24

کمال احمد صدیقی کا بھی یہ ماننا ہے کہ سوشلزم کی طرف اقبال کے جھکاؤ کی وجہ اس کے نظریے کا اسلام سے میل کھانا ہے۔ چونکہ اسلام کی تعلیمات اور سوشلزم کے بہت سے اصول آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے بالشوزم میں خدا کا تصور شامل کر کے اسے قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ناقد اقبال کے سوشلزم کو اسلامی رنگ میں رنگا ہوا پاتے ہیں اور اقبال کو صرف سوشلسٹ کہنے کے بجائے اسلامی سوشلسٹ کہنا بہتر سمجھتے ہیں، اقبال کا خیال ہے کہ خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ ہی غریبوں کی تکلیف کا حل ہو سکتا ہے اور وہ حل انہیں سوشلزم میں نظر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس تحریک کا کھل کر ساتھ دیا تا کہ نظام جبر سے انسانیت کو نجات دلائی جا سکے۔ اقبال چونکہ مزدور کا حامی ہے اس کے خیال میں سرمایہ دار کو مزدور کی محنت کا پھل حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کیوں کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اور سوشلزم کا مقصد بھی یہی ہے۔ اقبال اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتے ہیں اور انہیں ان کے مقصد تک پہنچانے میں سوشلزم ان کی مدد کرتا ہے، اس لیے اقبال کا جھکاؤ تیزی کے ساتھ اس طرف ہوا اور اقبال نے اپنی تمام تر مسلمانیت کے باوجود اسے لبیک کہا اور اس کا استقبال کیا۔

اب آخر میں محمد علی صدیقی کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے

اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے میں شامل اقبال پر ایک مضمون میں تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی اور قوم پرست اقبال کی رائن اور ڈینیو کے کنارے گم شدگی یورپی قوم پرستی کے بارے میں اُن کے انتہائی سخت موقف کا ثبوت ہے۔ قوم پرستی کی مخالفت اور بین الاقوامیت پر بڑھتے ہوئے اصرار کے پیچھے یہ ضروری نہیں کہ اقبال لامحالہ مارکسی نظریۂ تاریخ کی ایک ضروری شق پر شعوری طور پر صاد کر رہے ہوں۔ لیکن اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ۱۹۰۴ء میں ''مخزن'' میں مطبوعہ مضمون ''قومی زندگی'' میں اقبال نے قومی معیشت کے سوال کو جس طرح چھیڑا ہے وہ مسلمانان ہند کے لیے کافی چونکا دینے والا تھا۔ ''یورپ کے تاثرات جو محمد بدرالدین خاں شکیب کی مرتب کردہ کتاب ہے اور جس میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یورپی درسگاہوں سے فارغ شدہ پچیس مسلمان اور ہندو اساتذہ، فلاسفر، معالجین، اور اعلیٰ عہدیداروں کے تاثرات درج ہیں۔ حال ہی میں میری نظر سے گذری، حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب پچیس مشاہیر وقت میں سے کسی ایک نے بھی یورپ میں ۱۸۷۰ء کے بعد سے بڑھتی ہوئی اشتراکی قوتوں، انیسویں صدی کی مادّیت اور اخلاقی خلفشار کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ سب حضرات ہی یورپ کی ترقی پر ششدر نظر آتے ہیں۔ اور اپنے ہم وطنوں کی تنزلی پر کڑھتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان بزرگوں کو یورپ اور ہندوستان میں صرف ایک ہی فرق نظر آتا رہا۔

ایک ترقی پذیر یا ترقی یافتہ اور دوسرا ترقی کی دوڑ میں لنگڑا کر چلتا ہوا کمزور لیکن دیوہیکل منطقہ ارضی، لیکن زیادہ سے زیادہ تجزیاتی مطالعہ یہ ملتا ہے کہ فرنگی محنتی ہوتے ہیں اور ہم کاہل اگر محنت کرنے لگیں تو بیڑا پار ہو جائے۔ کم از کم اس کتاب میں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ اور ایک طرف یہ کتاب اقبال کے پیش روؤں اور ہم عصروں کے خیالات کا ایک ایسا مرقع ہے جو اقبال کی اہمیت متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔'' 25

اِن تمام بحثوں کے نتیجے کی شکل میں جو بات صاف طور پر سامنے آئی ہے اُس کے دو پہلو ہیں اوّل کہ اقبال اشتراکیت کے حامی ہیں دوئم یہ کہ وہ اس تحریک کے بعض بنیادی پہلوؤں سے اتفاق نہیں رکھتے خصوصاً وہ اس تحریک کے ملحدانہ عنصر کو برداشت نہیں کر سکتے۔

حواشی

۱۔ اقبال کے ابتدائی افکار.....	ڈاکٹر عبدالحق	صفحہ ۱۱
۲۔ اقبال کامل.....	عبدالسلام ندوی	صفحہ ۲۵۷
۳۔ ایضاً	ایضاً	صفحہ ۳۵۹
۴۔ فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	صفحہ ۲۲۲
۵۔ فکر اقبال	//	۲۳۱
۶۔ //	//	۲۳۱
۷۔ روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲۷۷
۸۔ اقبال مذاکرے کے چند مقالات	//	۱۰۷۔۱۰۶
۹۔ جوہر اقبال	عبدالرحمٰن طارق	۲۹۷
۱۰۔ //	//	۲۹۷
۱۱۔ اقبال مغربی مفکرین کی نظر میں	ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد	۷۶۔۷۵
۱۲۔ //	//	۸۰
۱۳۔ //	//	۸۲
۱۴۔ //	//	۸۳
۱۵۔ ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۱۱۷
۱۶۔ //	//	۱۱۷
۱۷۔ نقطہ نظر	ڈاکٹر عبدالمغنی	۱۸

۱۸۔ جادۂ اعتدال	//	۵۴
۱۹۔ تشکیل جدید	//	۴۴
۲۰۔ جادۂ اعتدال	//	۵۲_۵۳
۲۱۔ //	//	۵۳
۲۲۔ نقطۂ نظر	//	۱۶
۲۳۔ اقبال شناسی کے کچھ پہلو	کمال احمد صدیقی	۵
۲۴۔ اقبال شناسی کے کچھ پہلو	کمال احمد صدیقی	۶_۷
۲۵۔ توازن (ترقی پسندی کی ایک جہت اقبال)	محمد علی	۲۱۰

☆☆☆

حاصل بحث

اقبال اور اشتراکیت سے متعلق خود اقبال کے خطوط، مضامین اور اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے ناقدین کی آرا کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کریں تو سب سے پہلے ہم اقبال کے اس خط کا حوالہ دیں گے جس میں انہوں نے اشتراکیت سے اپنی برأت کا اعلان کیا تھا۔ اس خط میں جو بات سب سے زیادہ توجہ طلب ہے وہ ان کا فوری ردّ عمل ہے جو اس قسم کے الزام سے ان کے قلب و ذہن پر ہوا۔ گویا اشتراکیت یا بالشویک خیالات سے نسبت دی جانے کو وہ خلاف مذہب سمجھتے تھے۔ اور اس کا اعتراف بھی انہوں نے کیا۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال مذہب اور اشتراکیت میں قدر اختلاف کو سختی سے تسلیم کرتے تھے۔

اب عبدالسلام ندوی کا یہ کہنا کہ ''قرآنی تعلیمات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب اخلاقی حیثیت سے بھی اشتراکی تحریک کی تائید کرتے ہیں'' ناقد و فن کار میں نظریاتی تضاد کی مثال پیش کرتا ہے۔

اقبال کو مذہبی یا اسلامی شاعر تسلیم کر لینا علامہ کے ساتھ کسی قدر زیادتی ہے۔ اگر انہیں صرف مسلمانوں کا شاعر فرض کر لیا جائے تو ان کی اس مشہور نظم کو جس کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم کا کہنا ہے کہ یہ نظم لینن تک پہنچ جاتی تو وہ اُسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ بنا دیتا، کہاں رکھا جا سکتا ہے؟

اقبال شاعر انسانیت تھے۔ انہوں نے آفاقی مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نگاہ میں محنت کش طبقہ خواہ وہ کسی بھی مذہب یا قوم سے تعلق رکھتا ہو ہمدردی کا مستحق ہے۔ کیا اقبال کے لیے یہ کہنا آسان نہیں تھا کہ:۔

اٹھو میری دنیا کے مسلماں کو جگادو
کاخ امرا کے درو دیوار ہلا دو
گرماؤ مسلماں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرد مایہ کو شاہیں سے لڑادو
جس کھیت سے مسلم کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلاد و

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اقبال کے سامنے مسئلہ صرف مسلمان کا نہیں تھا ان کے سامنے ساری دنیا کے محکوم و مجبور اور مقہور و غریب تھے۔ مسلمانوں کا لہو گرمانے سے زیادہ انہیں غلاموں کے لہو میں آتشیں جذبات بیدار کرنے کی فکر تھی۔ وہ اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دینا چاہتے تھے۔ جس کھیت سے دہقاں کو روزی میسر نہ ہو۔ اور دہقاں عالمی محنت کش کی علامت کے طور پر اقبال کے یہاں استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال فطرت سے ایک دردمند دل لے کر آئے تھے۔ وہ اپنے آس پاس ایک بہتر سماج کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس انقلابی پیغام کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ایک خاص پیرایۂ بیان ضروری تھا۔ جس وسیلہ اظہار کی انہیں تلاش تھی وہ مذہب اسلام نے انہیں فراہم کر دیا۔ چنانچہ اسلام اقبال کے یہاں اپنی بات کو پُر اثر، وقیع اور قابل عمل بنانے کی غرض سے وسیلے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اور جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خود بھی راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ بقول کمال احمد صدیقی۔

''عقلیت اور استدلال پسندی انہیں ''نصف کلمہ'' کی سرحد تک

لے گئی۔ پھر وہ شعوری طور پر اور شاید خود پر جبر کر کے..... مذہب کی طرف واپس آئے''1

لہٰذا انہوں نے صرف مسلمانوں کے لیے بھی بہت کچھ کہا۔ لیکن ان کے کلام کا جو حصہ آفاقی مسائل کو پیش کرتا ہے اسے ہم صرف مسلمانوں سے منسوب کر کے شاعر انسانیت کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔

اقبال ہم کو کسی بھی جگہ مبلغ اسلام کی حیثیت سے نظر نہیں آتے۔ جب کہ ان کے کلام میں اسلام ناگزیر ہے۔ اس طرح غالباً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کسی شئے کو آپ وسیلے کے طور پر استعمال کریں گے تو اس کا وجود ناگزیر ہوگا حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک انسانی دُکھ درد کے مسائل بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی نوع انسانی دو بڑے طبقات میں تقسیم رہی ہے۔ ایک طبقہ حکومت کرنے والا دوسرا احکام بجانے والا۔ اور ان دونوں طبقوں میں ازل ہی سے کش مکش چلی آرہی ہے۔ سرمایہ دار اور محنت کش کی اس کش مکش پر علامہ اقبال جیسا حساس دل رکھنے والا بے حد مضطرب ہوتا ہے، اور وہ محنت کش کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے والے سرمایہ دار کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے۔

سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کے خلاف سب سے بلند آواز کارل مارکس کی تھی۔ اس نے طبقاتی فرق کو ختم کرنے کے لیے ایک نئے نظام کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر اقتصادیات کے اصولوں میں تلاش کی۔ اقبال اور مارکس اس مسئلے پر یکساں طور پر پریشان ہیں اور اپنے اپنے طور پر ان مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ یہاں اقبال اور مارکس کے درمیان دو باتوں پر بہت زیادہ اختلاف ہے۔ مارکس کے نزدیک مادّے کی اہمیت ہی اصل ہے اور خدا کا وجود فرضی ہے۔ جب کہ اقبال خدا کی ذات پر مکمل اعتقاد رکھتے ہیں اور مادّے کی اہمیت سے منکر بھی نہیں ہیں۔ لیکن روحانیت کے بھی قائل ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ موجودہ سماج کے بہت سے مسائل کا حل تلاش کرنے میں کارل مارکس کی کوششیں لائق ستائش ہیں۔ مارکس نے اپنے دور کے مسائل کا گہری نظر سے تجزیہ کیا اور ان پر تنقید کر کے جو نتائج اخذ کیے وہ بیشتر لوگوں کے لیے قابل قبول تھے۔ مارکس نے اقتصادیت کو بھی اہمیت دی اس کا منطقی جواز موجود ہے۔

۱۸۱۸ء میں مارکس پیدا ہوا تو انقلاب فرانس کی یادیں لوگوں کے ذہنوں میں تازہ تھیں۔ مارکس نے اقتصادی انقلاب کو کامیاب ہوتے دیکھا کیونکہ طبعیاتی سائنس کے ارتقاء اور صنعتوں کی وسعت نے اقتصادیات کی اہمیت تسلیم کرادی تھی اور اس پہلو پر زور دینے کا سبب سیاسی حالات اور سماجی ضروریات ہی تھیں۔ اقتصادی اصولوں کی کامیابی نے جس کا اصل سہرا سائنس کی ترقی اور صنعتی دور کے سر تھا، یہ رُجحان پیدا کر دیا کہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کو اقتصادیات کی مدد سے حل کیا جاسکتا ہے۔ پھر کیا تھا زندگی کے تمام پہلوؤں مذہبی، تہذیبی اور سیاسی کو اقتصادی اقتدار کے پیمانے سے ناپا جانے لگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اقتصادی مسئلہ ہی تو ہماری کل زندگی نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسانی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہی ہے۔ ہاں اہم پہلوؤں میں ایک پہلو ضرور ہے۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال کارل مارکس کے فلسفہ اُشتراکیت کو علامہ اقبال کے ہاں اسی صورت میں قبولیت حاصل ہے جب تک کہ وہ ان کے مذہبی خیالات کی تردید نہیں کرتا۔ اشتراکیت اقبال کے کلام میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور ان کی بہت سی مشہور نظمیں اسی مسئلہ کا اظہار کرتی ہیں۔

میر اجگن ناتھ آزاد کے اس خیال سے اتفاق کرنا دشوار ہے کہ ''اقبال کے لیے اس نظریئے کو قبول کر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ایک اشتراکی کے لیے خدا اور روح اور مذہب ان تینوں کا انکار لازمی ہے'' حالانکہ جگن ناتھ آزاد اگر لینن کی

اشتراکیت کے بارے میں تشریح ملاحظہ فرمائیں (باب اوّل کا صفحہ اوّل) تو ان پر یہ راز بھی منکشف ہوگا کہ اشتراکی کا مفہوم ہے مشترکہ تقسیم یعنی مل بانٹ کر چیز کے استعمال میں یقین رکھنے والا۔ اس تشریح میں تو کہیں بھی خدا، روح یا مذہب سے انکار کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک علاحدہ بحث ہے کہ زیادہ تر اشتراکی مذہب، خدا اور روح میں یقین نہیں رکھتے، بہرحال یہ کلیہ نہیں ہے اور جب ہم کسی شخص کو اشتراکی کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی ہے کہ ان اصول ونظریات پر یقین رکھنے والا جس کی رو سے ایک ایسے سماجی نظام کی تشکیل ممکن ہے جہاں انفرادی ملکیت کو اِجتماعی ملکیت میں تبدیل کر دیا جائے۔

اقبال کی مزدور کے حق میں سرمایہ داروں کے خلاف نظمیں اور اشعار پڑھنے کے بعد اقبال کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ وہ ایک اشتراکی تھے کسی بڑے اعتراض کی بات نہیں۔ اور نہ ہی اسے ہم اقبال کی شان میں کوئی گستاخی قرار دے سکتے ہیں۔ میرے اس دعوے کی تائید محمد علی صدیقی بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''میں اقبال کے بارے میں سکہ بند سوشلسٹوں کے خیالات رقم کرنے سے قصداً پرہیز کر رہا ہوں شاید ان خیالات کی اشاعت زیادہ سود مند بھی نہ ہو اور خواہ مخواہ ایک منفی ردّ عمل کو تقویت دے۔ ورنہ بات تو یہ ہے کہ اقبال حسرت موہانی کی طرح ایک اشتراکی مسلم تھے۔ لیکن کیا کیا جائے بعض شارحین اقبال اپنے نجی نقطہ نظر کو فکری چھینا جھپٹی کے اس دور میں خواہ مخواہ اقبال کے سر منڈھ دیتے ہیں اور اقبال کو اپنے 'طرف کی سطح پر کھینچ لاتے ہیں۔ جس سے اقبال فہمی کی بجائے شارحین اقبال فہمی کی ابتدا ہو جانی چاہئے۔ ''اشتراکی مسلم'' کی اصطلاح بھی سر فرانسس ینگ ہز بینڈ کے نام اقبال کے خط میں درج ہے جس

میں اقبال نے بالشوزم اور اسلام کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔''2

اقبال کو اشتراکی مسلم کہنا مناسب نہیں۔ ان کا مسلمان ہونا الگ معاملہ ہے اور ان کے کلام کی روشنی میں ان کا اشتراکی ثابت ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ لہٰذا میرا یہ کہنا مناسب لگتا ہے کہ اقبال اشتراکی تھے اور انہوں نے اشتراکیت کی حمایت میں اس قدر نظمیں کہیں ہیں کہ انہیں اشتراکیت کا مبلغ اعلیٰ بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

''اشتراکی مسلم'' کی اصطلاح اقبال اور ناقدین اقبال کے اس محتاط رویے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انہیں ملت کی برہمی کے خوف سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا کہ حامیان اقبال صاف طور پر یہ بات سننے کے لیے تیار نہیں کہ ایک ایسے عظیم شاعر اور مسلمانوں کے ہمدرد کو اس جماعت سے منسوب کیا جائے جو عام آدمی کی نظر میں خدا کے منکروں کی جماعت ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کے معاملے کو اس طور پر درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اہل ثروت جس میں متوسط طبقہ بھی آتا ہے اپنی کمائی کا تھوڑا حصہ زکوٰۃ کے طور پر ان لوگوں کو دیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ پھر قانون میراث کے ذریعے بھی اقتصادی مسائل کے حل پیش ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:

''قرآن کریم نے اس قوت کو (سرمایہ داری کی قوت) مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث، حرمت رُبا اور زکات وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔''3

اس صورت میں اقبال کے نزدیک نادار و مفلس لوگوں کے تئیں اہل ثروت یا تھوڑی بہت استطاعت رکھنے والوں کے سخت اور ظالمانہ رویے کے خلاف احتجاج کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن کلام اقبال کا مطالعہ کیجئے تو کہیں بھی زکات ادا نہ کرنے، میراث کے قوانین کا پاس نہ کرنے اور دوسرے اسلامی احکامات کی خلاف ورزی

کرنے پر اقبال کہیں شکوہ گو تو کجا ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے۔

سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش پر ان کا مضطرب ہونا فطرت انسانی پر ہی محمول کیا جائے تو بھی اقبال سا دردمند دل رکھنے والا اس حقیقت کو کیوں فراموش کرتا ہے کہ محنت کش کے علاوہ بھی ایسے طبقے موجود ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی بمشکل نصیب ہو رہی ہے اور اگر صاحب استطاعت مسلمان ایمانداری کے ساتھ زکات ادا کرتے رہیں تو ان غریبوں کی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے یہاں محنت کش اور سرمایہ دار کی کشمکش پر احتجاج کا رویہ لازمی طور پر اشتراکیت کے تئیں ان کے پسندیدہ نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے۔

اقبال اس اخلاقی جرأت کا مظاہرہ نہ کر سکے جس کی تلقین کلام اقبال میں جا بجا ملتی ہے۔ اقبال کسی بھی قیمت پر ملت کے جذبات کو مجروح کرنے کی ہمت نہیں کر پائے اور وہ ہمیشہ اپنے اشتراکی نظریات کو مذہب کے دبیز پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس رویے کے پس منظر میں سوائے اس خوف کے کچھ اور نہیں کہ اشتراکیت کی حمایت کا اعتراف ان کے حق میں لامذہبیت کی دلیل بن جائے گا۔

حالانکہ اشتراکی خیالات اور اشتراکی نظام کی حمایت کر کے ہم اسلام کی نفی نہیں کرتے بلکہ اسلام تو خود ایسی تمام تحریکات کی حمایت کرتا ہے جو بنی نوع انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرتی تھیں۔ جہاں تک مزدور کے حقوق کی حمایت کا تعلق ہے حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مزدور کی اُجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی ادا کر دو۔ اقبال مزدور کا حامی ہے اس کے خیال میں سرمایہ دار کو مزدور کی محنت کا پھل حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے اور سوشلزم کا مقصد بھی یہی ہے۔

علامہ اقبال اگر اشتراکیت سے اپنی برأت کا اعلان کرنے کی بجائے اشتراکیت کے اصل مفہوم کی وضاحت کرتے تو میرا خیال یہ ہے کہ ملت ان کے

موقف کو ضرور سمجھتی اور ان کی مسلمانوں کے ہمدرد کی حیثیت سے مقبولیت میں قطعاً کوئی کمی نہیں آتی۔

بہر حال یہ علامہ اقبال کے ذاتی خیالات تھے۔ انہوں نے وہی کہا جو ان کے مزاج اور اس وقت کے سماجی اور سیاسی حالات کا تقاضا تھا لیکن ان کے اشتراکیت سے برأت کے اعلان سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اشتراکی نہیں تھے۔ وہ اقبال جو دوران قیام یورپ میں عقلیت کے اثر سے نصف کلمہ گو ہو سکتا ہے اور وہ دہریت اور الحاد کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ کیا وہ اقبال اشتراکیت کا حامی یا اشتراکی کیوں نہیں ہو سکتا۔ اقبال کو مبلغ اسلام کی حیثیت سے پیش کرنے والے یہی حامیان اسلام ہیں جنہوں نے علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ کیا اقبال اس وقت منکر خدا ہو گئے تھے جو یہ نوبت آ گئی تھی۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ علامہ اقبال کی فکر کے بہت سے دھارے ملا اور مولوی سے میل نہیں کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ احیائے اسلام اور نئے مسلم معاشرے سے متعلق اقبال کا نظریہ اجتہادی تھا۔ نظریہ خودی پیش کرنے اور وجودی تصوف کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے پر صوفیائے قدیم کے حامی، روایتی سجادہ نشیں ان کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ ان کی نظم ''شکوہ اور آفتاب پر بھی کافی لے دے ہوئی۔ مثنوی اسرار خودی'' پر اقبال کو دہریا، دشمن اسلام، دین و ملت فروش، رہزن ایماں اور شیطان کے القاب سے پکارا گیا۔ لیکن ان مخالفتوں کے باوجود اقبال کی فکر پر کوئی قدغن نہیں لگا سکا اور اقبال نئے معاشرے کے قیام کی جد و جہد میں مصروف رہے۔ جہاں کہیں سے بھی تبدیلی کے آثار نظر آئے اقبال نے اس کا بڑھ کر استقبال کیا۔ منفی پہلوؤں کو درکنار کرتے ہوئے اس کے مثبت پہلوؤں پر زیادہ نظر رکھی۔ معاشرے کے جبر و ستم سے انسان کو نجات دلانے کے لیے ہر اس انقلاب کا خیر مقدم کیا جو انسانیت کی فلاح کے لیے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ اشتراکیت کے مثبت پہلوؤں سے جو انسانیت کی فلاح اور اس کی بقا کے لیے تھا استفادہ کرتے ہوئے

انقلاب روس کا خیر مقدم کیا۔ اب جہاں تک اقبال کے بیان کا تعلق ہے تو صرف بیان سے کیا ہوتا ہے۔ کلام اقبال تو ان کے اس دعوے کی تردید کرتا ہے۔ اور چونکہ اس وقت علامہ ہمارے درمیان نہیں ہیں ورنہ ممکن ہے اس معاملے میں ان سے ذاتی طور پر بحث کر کے اس حقیقت کا اعتراف کرالیا جاتا کہ وہ خدا کی ذات پر پورا ایمان رکھتے ہوئے بھی اشتراکیت کے حامی و مبلغ ہیں۔

مجھے ان معزز و معتبر ناقدین سے سخت شکایت ہے کہ اشتراکیت اور اقبال کے سلسلے میں کسی ایک نے بھی علامہ کے بیانات کو اپنے اپنے اُسلوب میں دُہرانے کے علاوہ انفرادی طور پر سنجیدگی سے اس مسئلے پر توجہ نہیں دی بلکہ محض علامہ کے عقیدت مندوں کی فہرست میں شامل ہونے اور اہل اسلام کی نظروں میں ناپسندیدہ قرار دیئے جانے سے بچنے کی خاطر آنکھ بند کر کے علامہ کے ارشادات کو نقل کرتے چلے گئے۔ یہ رویہ بہر حال ایک ناقد کے لیے کسی طور بھی مناسب نہیں کہ وہ تنقید جیسا اہم فرض ادا کرتے ہوئے عقیدت سے کام لیں۔ اس طرح وہ ایک طرف تو اس فرض سے منصفانہ عہدہ برآ نہیں ہوتے اور دوسری جانب خود اقبال کے ساتھ سخت ناانصافی کرتے ہیں۔

اقبال کو اشتراکی کہنے یا اشتراکیت کا ہمدرد کہنے سے علامہ کی شاعرانہ حیثیت پر قطعاً حرف نہیں آتا بلکہ ذرا وسیع النظری سے کام لیا جائے تو علامہ کی شخصیت میں ایک اہم خوبی کا اضافہ ہی ہوتا ہے۔

اقبال کے معتقدین سے نہایت مودبانہ درخواست ہے کہ علامہ کی شخصیت پر صرف مسلمانوں کے ہمدرد کا لیبل لگا دینے کی بجائے اگر وہ ان کی شخصیت کے آفاقی پہلو کو پیش نظر رکھ کر میری باتوں پر غور کریں تو یقین ہے کہ بات ان کی سمجھ میں آئے گی اور میرے ضمیر کو اطمینان ہو جائے گا کہ علامہ کے ساتھ انصاف کرنے کی میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔

حواشی

۱۔ اقبال شناسی کے کچھ پہلو — کمال احمد صدیقی۔ — ایوان اردو اگست ۲۰۰۱ ص: ۶

۲۔ توازن۔ — احمد علی صدیقی — ص: ۲۲۰

۳۔ خطوط اقبال۔ — مرتبہ رفیع الدین ہاشمی — ص: ۱۵۵

کتابیات

۱۔ رینڈم ہاؤس ڈکشنری آف انگلش لینگویجز

۲۔ لینن — نوجوانوں کی انجمن کے فریضے

۳۔ کارل مارکس — کمیونزم کے بارے میں سوالات و جوابات

۴۔ مارکس — گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر

۵۔ مارکس — کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو

۶۔ خطوط اقبال — رفیع الدین ہاشمی۔ لاہور

۷۔ کلیات مکاتیب اقبال دوم	مظفر حسین برنی۔ دلی
۸۔ کلیات مکاتیب اقبال چہارم	مظفر حسین برنی۔ دلی
۹۔ بکھرے خیالات	عبدالحق
۱۰۔ علم الاقتصاد	علامہ اقبال
۱۱۔ کلیات مکاتیت اقبال سوم	مظفر حسین برنی۔ دلی
۱۲۔ اقبال کے نثری افکار	علامہ اقبال
۱۳۔ موڈرن اسلام اِن انڈیا	
۱۴۔ ڈسکوری آف انڈیا	جواہر لعل نہرو
۱۵۔ کلیات اقبال اُردو	اقبال۔ لاہور
۱۶۔ کلیات اقبال فارسی	اقبال۔ لاہور
۱۷۔ پیام مشرق	اقبال
۱۸۔ اقبال کے ابتدائی افکار	عبدالحق
۱۹۔ اقبال کامل	عبدالسلام ندوی
۲۰۔ فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
۲۱۔ روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۲۲۔ اقبال مذاکرے کے مقالات	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۲۳۔ جوہر اقبال	عبدالرحمٰن طارق
۲۴۔ اقبال مغربی مفکرین کی نظر میں	ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد
۲۵۔ ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری
۲۶۔ نقطہ نظر	ڈاکٹر عبدالمغنی
۲۷۔ جادۂ اعتدال	//
۲۸۔ تشکیل جدید	//

۲۹۔ توازن	محمد علی صدیقی
۳۰۔ اقبال کا نظام فن	ڈاکٹر عبدالمغنی
۳۱۔ اقبال اور عالمی ادب	//
۳۲۔ اقبال اور عالمی ادب	کلیم الدین احمد ۔

مختصر تعارف

۱۔ نام	:	محمد جمیل اختر
۲۔ والد	:	محمد نواب حسن
۳۔ والدہ	:	عظمت النساء
۴۔ تاریخ پیدائش	:	۱۵/اگست ۱۹۵۸
۵۔ مقام پیدائش	:	موضع گرہول شریف ضلع سیتامڑھی۔ بہار: (نانیہال)
۶۔ وطن	:	موضع کمہرولی۔ دربھنگا، بہار
۷۔ تعلیم	:	ابتدائی تعلیم: درس گاہ اسلامی کمہرولی
ہائی اسکول	:	کمتول ہائی اسکول۔ ۱۹۷۴
گریجویشن	:	ملت کالج، میتھلا یونیورسٹی، دربھنگا ۱۹۸۰
اعلیٰ تعلیم	:	ایم اے۔ ایم فل، پی ایچ ڈی (اردو) ۱۹۹۵ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی
ڈپلوما ان ماس میڈیا:		جواہر لعل نہرو یونیورسٹی ۱۹۸۳
۸۔ ملازمت	:	

۱۔ ایم اے کے بعد این سی ای آر ٹی کے شعبہ غیر رسمی طریقہ تعلیم میں درسی کتابوں کی تیاری کے ایک پروجیکٹ میں ۱۹۸۶ سے ۱۹۸۹ تک بطور پروجیکٹ فیلو کام کیا۔

۲۔ نوح کالج ہریانہ (میوات) میں تین ماہ تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔

۳۔ ۱۹۸۴ تا ۱۹۸۵ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بطور ریسرچ اسکالر تدریس کا فریضہ انجام دیا۔

۴۔ ان دنوں ذریعہ معاش تجارت اور مشغلہ تصنیف و تالیف ہے۔

۹۔ تصانیف

۱۔ جنگ نہ ہونے دیں گے۔ اٹل بہاری واجپائی۔ ترتیب و ترجمہ لاہور۔ پاکستان

۲۔ اشاریہ آج کل (اول) اردو اکادمی، دلّی۔ ۱۹۸۸

۳۔ اشاریہ آج کل (دوم) زیر طبع

۴۔ عصمت چغتائی۔ نقد کی کسوٹی پر 2001

۵۔ ملاقاتیں قرۃ العین حیدر سے

۶۔ قرۃ العین حیدر کے باقی سب افسانے۔ (زیر طبع)

۷۔ اقبال اور اشتراکیت

۸۔ پڑھو اور بڑھو۔ این سی ای آر ٹی

۹۔ رہنمائے اساتذہ // //

۱۰۔ فرہنگ اصطلاحات ذرائع ابلاغ (اول)۔ (ڈراما)

۱۱۔ فرہنگ اصطلاحات ذرائع ابلاغ (ویڈیو، ٹی وی اور فلم)

۱۲۔ فرہنگ اصطلاحات ذرائع ابلاغ سوم (اخبارات و رسائل)

۱۳۔ فرہنگ اصطلاحات ذرائع ابلاغ چہارم (پرنٹنگ پریس)

۱۰۔ مضامین : مختلف موضوعات پر پندرہ مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ انٹرویوز : سعید انجم (ناروے) افتخار نسیم (امریکا)
شوکت صدیقی (پاکستان) ابن سعید (پاکستان)

قرۃ العین حیدر کے انٹرویوز شائع ہو چکے ہیں۔

۱۲۔ کتابوں پر تبصرے : پچیس سے زائد اہم ادبی کتابوں پر تفصیلی تبصرے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۳۔ اعزازات وانعامات :

۱۔ غالب کلچرا کیڈمی بنگلور نے ۱۹۸۹ میں ''مجاہد اردو'' ایوارڈ سے نوازا۔

۲۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے ۱۹۸۹ میں ''اشاریہ آج کل'' کو انعام سے نوازا

۳۔ سی ایل نیپالی ایوارڈ برائے مجموعی ادبی خدمات 2001

۴۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد دلی نے ''عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر'' کو جے نیندر کمار ایوارڈ برائے سال 2001 سے نوازا

۱۴۔ غیر ملکی سفر : اکتوبر ۱۹۹۱ء میں پاکستان کا سفر کیا۔ دو ماہ قیام رہا۔

۱۵۔ ریڈیو اور ٹی وی پروگرام :

ریڈیو پر لاتعداد پروگرام پیش کیے۔ مذاکرے انٹرویو میں شرکت کی۔ ٹی وی پر میرا پینل انٹرویو ''بزم'' سے نشر ہوا۔

۱۶۔ ادبی وثقافتی اداروں سے وابستگی:

۱۔ جنرل سکریٹری: انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن۔ دہلی

۲۔ کنوینر : سارک سٹیزن فورم دہلی

۳۔ ممبر : ساؤتھ ایشین، فریٹرنیٹی

۴۔ اب تک بیس سے زائد ادبی وثقافتی اداروں سے وابستہ رہا ہوں اور مختلف عہدوں پر کام کیا ہے۔

۵۔ ادبی اخبار (ہندی) کی مجلس ادارت میں شامل ہوں۔

۱۷۔ تحقیق کا موضوع :

۱۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا فکری اور فنی ارتقا'' پر ایم فل کی ڈگری ملی ۱۹۸۹ء

۲۔ قرۃ العین حیدر کے فکشن کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ 1995

۱۸۔ ادبی مشاغل :

تنقید و تحقیق اور شاعری

۱۹۔ مستقبل کا منصوبہ :

۱۔ اردو رسائل کا موضوعاتی اشاریہ'' اس منصوبے میں شروع سے اب تک ان تمام رسائل کو شامل کیا گیا ہے جو ہند و پاک کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور جن سے محقق استفادہ کرتا ہے۔

۲۔ مختلف اصناف و شخصیات کا اشاریہ (موضوعات کے لحاظ سے)

۳۔ ادبی اخبار کا اجراء

۴۔ نسائی ادب کی تاریخ

۵۔ قرۃ العین حیدر کی ناول نگار

۶۔ قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار

۲۰۔ رابطے کا پتہ :

D-149، ملی ٹائمز بلڈنگ۔ ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی۔ ۲۵ فون: 6197512